

الْقَوْلُ بِاللَّغَةِ الْعَرَبِيَّةِ

فُشِّحَ

الْحَقِيقَةُ الطَّحَاوِيَّةُ

کتاب ”عقیدہ طحاوی“ کی مختصر اور جامع شرح جس میں متن کے سلیس ترجمہ کے ساتھ مل عبارت اہم اور مفید مباحث سہل اسلوب میں پیش کیے گئے ہیں



تالیف
ابو سلمان زر محمد صاحب

مکتبہ عمر فاروق

شاہ فیصل کائناتی ٹیریڈ کراچی

الفوائد الدراسية فشرح العقيدة الطحاوية

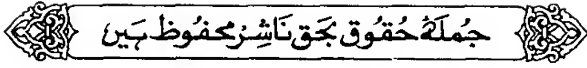
کتاب ”عقيدة الطحاوية“ کی مختصر اور جامع شرح جس میں متن کے سلیس ترجمہ کے ساتھ حل عبارت اہم اور مفید مباحث سہل اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں

تالیف
ابوسلمان زرمحمد صاحب

مکتبہ سیدہ فاطمہ

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

Tel: 021-34594144 Cell: 0334-3432345



نام کتاب الفوائد الدراسية في شرح العقيدة الطحاوية

تالیف ابوسلمان زر محمد صاحب

اشاعت اول جون 2010ء

تعداد 1100

طابع القادر پرننگ پریس کراچی

ناشر فیاض احمد 0334-3432345
021-34594144

مکتبہ عرفان وق 4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی

ملنے کے پتے

دائر الاشاعت ، لرہ بازار کراچی
اسلامی کتب خانہ ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
قدیمی کتب خانہ ، آسام باغ کراچی
ادارۃ الانور ، علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
مکتبہ رشیدیہ ، سرکی روڈ کوئٹہ
کتب خانہ رشیدیہ ، راجست بازار اولہ سنہادی
مکتبہ العکافی ، جامعہ اسلامیہ ہستیانہ روڈ فیصل آباد
مکتبہ رحمانیہ ، لرہ بازار لاہور
مکتبہ سید احمد شہید ، لرہ بازار لاہور
مکتبہ علمینہ ، بی بی روڈ اکوڑہ ٹکٹ منٹل نوشہرہ
وحیدی کتب خانہ ، علاقہ چکی حسنہ خان بازار پشاور

فہرست

نمبر شمار	عنوانات	صفحات
۱	تقریظ: حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب	۵
۲	انتساب	۶
۳	کچھ کتاب کے بارے میں	۷
۴	پیش لفظ	۹
۵	حالات مصنف	۱۴
۶	توحید	۱۹
۷	عقیدہ کی تعریف	۱۹
۸	التوفیق	۱۹
۹	توحید کی اہمیت	۲۰
۱۰	ارادہ کی تعریف	۲۳
۱۱	رسالت	۳۶
۱۲	نبی اور رسول میں فرق	۳۷
۱۳	قرآن مجید	۴۱
۱۴	صفات باری تعالیٰ	۴۲
۱۵	رؤیت باری تعالیٰ	۴۳
۱۶	معراج	۵۲
۱۷	حوض کوثر	۵۴
۱۸	شفاعت	۵۵

۱۹	عهد یشاق.....	۵۶
۲۰	لوح قلم.....	۶۱
۲۱	عرش و کرسی.....	۶۵
۲۲	فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان.....	۶۸
۲۳	اہل قبلہ کی تعریف.....	۶۹
۲۴	کرانا کاتبین.....	۸۷
۲۵	ملک الموت.....	۸۸
۲۶	عذاب قبر.....	۸۹
۲۷	بعث کی تعریف.....	۹۳
۲۸	افعال العباد.....	۱۰۰
۲۹	خلق اور کسب کا فرق.....	۱۰۰
۳۰	ایصال ثواب.....	۱۰۳
۳۱	خلافت.....	۱۰۸
۳۲	عشرہ مبشرہ.....	۱۱۲
۳۳	معجزہ اور کرامت کا فرق.....	۱۱۵
۳۴	اقسام خارق عادت.....	۱۱۶
۳۵	علامات قیامت.....	۱۱۷



بسم الله الرحمن الرحيم

تقریظ

مناظر اسلام حضرت مولانا ڈاکٹر منظور احمد مینگل صاحب

استاد الحدیث جامعہ فاروقیہ

حامداً ومصلیاً وبعد : اس میں کوئی شک نہیں کہ اعمال کی قبولیت کا دار و مدار عقائد صحیحہ پر ہے، اگر عقائد ہی درست نہ ہوں، تو مجاہدے و ریاضات سے کچھ حاصل نہ ہوگا، اسی لئے سلف صالحین نے عقائد کی اصلاح پر بہت زور دیا۔

عقائد کے باب میں امام طحاوی رحمہ اللہ کی ”العقیدۃ الطحاویۃ“ کو اپنے اختصار و جامعیت کی بناء پر مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بلا تفریق مسلک اہلسنت والجماعت کے تمام مکاتب فکر کے ہاں اسے مسلمہ حیثیت حاصل ہے، حتیٰ کہ غیر مقلدین جو فروعات میں مقلدین کو گمراہ اور بدعتی کہتے ہیں، عقائد کے باب میں یہی کتاب پڑھاتے ہیں۔ یوں تو اس کی عربی شروحات کافی ہیں، لیکن اردو میں کوئی ایسی شرح جو اس کے معانی و مطالب کو واضح کرے، موجود نہ تھی۔ مولانا زمر محمد صاحب استاد جامعہ فاروقیہ کراچی جو ایک تحقیقی ذوق رکھنے والے عالم ہیں، انہوں نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اس کی اردو شرح لکھنے کا التزام کیا۔

اپنی گونا گوں مصروفیات کے باعث مکمل کتاب تو نہ دیکھ سکا۔ چند ایک مقامات ملاحظہ کئے جو کافی تسلی بخش و حوصلہ افزاء ہیں۔

امید ہے کہ علماء و طلباء کے لئے یہ ایک بہترین کاوش ثابت ہوگی۔

(حضرت مولانا منظور احمد مینگل صاحب)

انتساب

احقر اپنی اس صغیر، مگر مبارک کام کو اپنے والد محترم اور والدہ
مرحومہ کی طرف منسوب کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے،
جن کی حُسن تمنا، دعاؤں اور محنتوں سے اس لائق ہوا۔
ربِّ ارحمہما کما ربَّیَّانی صیغرا .

زر محمد غفرلہ

کچھ کتاب کے بارے میں

العقيدة الطحاوية المسماة بـ ”بيان السنة والجماعة“ تیسری صدی ہجری کے تبحر عالم، امام ابو جعفر طحاوی حنفی رحمہ اللہ کی تصنیف ہے۔ ”عقيدة الطحاوية“ کے نام سے مشہور اور متداول یہ کتاب، مختصر ہونے کے باوجود تمام دینی عقائد کے اصول پر حاوی ہے، گویا امام طحاویؒ کا یہ رسالہ ”بقامت کہتر، بقیمت بہتر“ کا مصداق ہے، یہ کتاب اپنی خصوصیات اور جامعیت کی وجہ سے عقائد کی اہم کتاب شمار کی جاتی ہے، امام طحاوی کی علمی عظمت حقیقت شناسی اور حسن بیان کی وجہ سے کتاب ”عقيدة الطحاوية“ کو احناف کے علاوہ اہل السنة والجماعة کے تمام مکاتب فکر میں شہرت ملی، عقيدة طحاویہ اس وقت دنیا کی تمام اہم درسگاہوں میں پڑھایا جاتا ہے۔

کتاب کی اہمیت کو دیکھتے ہوئے دو سال قبل ارباب وفاق المدارس العربیہ کی تعلیمی کمیٹی نے ”العقيدة الطحاوية“ کو درجہ العالیہ (سادسہ) کے مجوزہ نصاب میں داخل کر دیا، چنانچہ اب یہ کتاب الحمد للہ تمام مدارس میں داخل درس ہے، اس رسالہ میں اختصار کے ساتھ تمام ضروری عقائد موجود ہیں یہ اس قابل ہے کہ طلبہ اس کو زبانی یاد کریں۔

یوں تو اس کتاب کی عربی شروحات کی تعداد تیرہ تک پہنچتی ہے جن میں اکثر شرح حنفی المسلک ہیں، لیکن ہمارے نصاب میں چونکہ صرف متن داخل ہے، اس لئے طلبہ کے لئے تفصیلی اور طویل شروحات کی طرف رجوع کرنا قدرے مشکل تھا۔

احقر تین سال سے شرح عقائد کے بعد یہ کتاب پڑھا رہا ہے، اس لئے پڑھاتے وقت یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ کتاب کی کوئی ایسی شرح ہو کہ جس میں

کتاب کی مختصر جامع اور طلب غور مباحث کی تشریح آجائے، چنانچہ الفوائد الدراسية في شرح العقيدة الطحاوية کے نام سے یہ شرح آپ کے ہاتھوں میں ہے، تشریحات لکھتے وقت عقیدۃ الطحاویہ کی عربی شرح ”شرح العقيدة الطحاوية“ مؤلفہ امام قاضی علی بن علی بن محمد بن ابی العزالد مشقی (المتوفی ۹۲۷ھ) اور عربی کی دوسری شرح ”شرح العقيدة الطحاوية“ مؤلفہ علامہ فقیہ محقق عبدالغنی القنیمی المیدانی الحنفی (المتوفی ۱۲۹۸ھ) کے علاوہ شرح العقائد، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کے علم الکلام اور دوسری کتب سے استفادہ کیا ہے، حسب ضرورت لغت اور ترکیب کا اہتمام بھی کیا ہے اور ترجمہ لکھتے ہوئے موجود اردو تراجم سے بھی جگہ جگہ استفادہ کیا ہے، اللہ تعالیٰ احقر کی اس کاوش کو قبولیت عطا فرمائے اور مزید اس سے بڑے کام کی توفیق عطا فرمائے۔

طلبہ کرام اور قارئین سے التماس ہے کہ احقر کو اپنی دعاؤں میں فراموش نہ کریں۔ جزاکم اللہ تعالیٰ

احقر زرمحمد غفرلہ

خادم تدریس جامعہ فاروقیہ کراچی

۲۲ جمادی الثانی ۱۴۲۷ھ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

پیش لفظ

احکام شرعیہ (یعنی جو احکام ہم کو شریعت سے معلوم ہوئے ہیں) دو قسم کے ہیں۔
(الف) کچھ تو وہ ہیں جو عمل سے تعلق رکھتے ہیں، یعنی جن میں اللہ تعالیٰ کا اپنے بندوں سے عمل کا مطالبہ ہو، بالفاظ دیگر جن میں کچھ کرنا پڑتا ہو، جیسے شریعت کا یہ حکم کہ نماز اور روزہ فرض ہے، معاملات بھی اس قسم اول ہی میں داخل ہیں۔ ایسے احکام کو احکام عملیہ اور احکام فرعیہ کہتے ہیں اور جس فن میں ان احکام کا بیان اور تفصیل ہے اس فن کا نام علم فقہ ہے۔

(ب) دوسرے کچھ احکام وہ ہیں جو اعتقاد کرنے سے تعلق رکھتے ہیں، بالفاظ دیگر جن میں کچھ کرنا نہیں پڑتا، بلکہ صرف دل سے ماننا پڑتا ہے مثلاً شریعت کا یہ حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک ہے، جی ہے، سمیع ہے، بصیر ہے، علیم ہے۔ قیامت، جنت، دوزخ سب برحق ہیں۔ ظاہر ہے مقصود اس سے کوئی عمل نہیں، بلکہ مان لینا اور اعتقاد کر لینا ہے۔ ایسے احکام کو احکام اعتقادیہ احکام اصلیہ کہتے ہیں اور جس فن سے ان احکام کا علم ہوتا ہے اس کو علم التوحید والصفات کہتے ہیں۔ نیز اس فن کو علم اصول الدین، علم العقائد اور علم الکلام بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت ہمارا موضوع بحث، احکام شرعیہ کی یہ قسم ثانی ہے۔

در اصل عقائد کی بڑی اہمیت ہے۔ عقیدہ دین اسلام کی اصل اور بنیاد ہے اور عمل اسکی فرع ہے اگر عقیدہ درست نہیں تو جہنم کا دائمی عذاب ہوگا، عمل میں کوتاہی ہو، تو نجات کی امید ہے، چاہئے ابتدا ہی میں ہو جائے یا سزا بھگتنے کے بعد جنت میں جائے۔

علم عقائد کی تدوین کا پس منظر:

پیغمبر اسلام کی وفات تک تمام مسلمانوں کا عقیدہ ایک ہی تھا، اصول و عقائد میں کوئی اختلاف اس وقت تک نہیں تھا، عقائد میں جو اختلاف پیدا ہوا، وہ صحابہ رضوان اللہ اجمعین کے

آخری زمانہ (زمانہ تابعین) میں ہوا اور پھر وقتاً فوقتاً اہل اسلام میں اصول و عقائد کا اختلاف پیدا ہوتا رہا، یہاں تک کہ بہتر (۷۳) فرقے بن گئے، جن کے اصول یہ آٹھ فرقے ہیں۔ (۱) معتزلہ (۲) شیعہ (۳) خوارج (۴) مرجہ (۵) نجاریہ (۶) جبریہ (۷) مشبہہ (۸) اہل السنۃ والجماعۃ۔

بہتر فرقے جو مشہور ہیں ان میں بھی کئی فرقے شاخوں کی صورت میں ظاہر ہوئے ہیں جو شخص جس فرقے کا کام کرے گا اسی میں شمار ہوگا۔ اُس وقت اہل بدعت زیادہ تر ”بدعة فی العقائد“ کے مجرم تھے، لیکن آج کل کے مبتدعین زیادہ تر ”بدعة فی الاعمال“ کے مرتکب ہیں۔

اس پہلے دور میں اہل بدعت مختلف شکلوں میں سامنے آئے اور پھر یہ سب مستقل فرقے بنے، لیکن اہل سنت عقائد میں سب سے الگ ہی رہے، اس کے بعد اہل السنۃ کا بڑا فروغی اختلاف باہم فتویٰ میں ہوا اور تھوڑا سا اختلاف اعتقادات میں بھی ہوا، لیکن اہل سنت کے اختلاف میں گروہ بندی نہیں تھی۔ فتویٰ میں چار مذاہب (حنفی، مالکی، شافعی، حنبلی) مدون ہو گئے۔ اور اعتقاد میں تین جماعتیں (اشعری، ماتریدی، حنبلی) ہو گئیں۔ مالکی اور شافعی لوگ امام ابو الحسن اشعریؒ کے تابع ہیں، اس لئے ان کو اشاعرہ کہا جاتا ہے اور حنفی لوگ امام ابو منصور ماتریدیؒ کے قول کے تابع ہیں، اس لئے ان کو ماتریدیہ کہتے ہیں۔ کبھی گمراہ فرقوں کے مقابلہ میں دونوں ہی کو صرف اشاعرہ کہہ دیتے ہیں۔ اور امام احمد بن حنبل کے مقلد حنبلی کہلاتے ہیں۔

یہاں یہ بات قابل ذکر ہے کہ امام طحاویؒ کے معاصر، امام ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۳۲۰ھ) جو امام الہدیٰ کے لقب سے مشہور ہیں، تین واسطوں سے امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد ہیں اور یہ ”ماترید“ جو کہ ماوراء النہر، سرقند کے قریب ایک گاؤں ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ تاویلات القرآن، کتاب المقالات، کتاب التوحید وغیرہ آپ کی گرانقدر تصانیف ہیں۔ امام ابو الحسن اشعری رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۳۲۰ھ) حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد میں سے تھے۔ ابتداء میں معتزلی

تھے، مگر قدرت کو ان سے کتاب و سنت کی حمایت و اشاعت کا کام لینا تھا۔ چنانچہ انہوں نے معتزلہ کا مذہب ترک کر دیا، امام ماتریدیؒ اور ابوالحسنؒ دونوں حضرات اہل السنۃ والجماعۃ کے عقائد میں امام ہیں۔ صرف چند ایک مسائل میں ان کا آپس میں اختلاف ہے۔ عقائد کے اعتبار سے گواہل السنۃ والجماعۃ میں بنیادی طور پر کوئی اہم اختلاف نہیں ہے، تاہم عقائد ماتریدیہ اس حیثیت سے ممتاز ہیں کہ ان کی تدوین فلسفہ کے اثر سے قطعاً پاک ہیں۔

(ملخص از بیان الفوائد و صدر الشواہد، مقدمہ اہل السنۃ والجماعت، و اسلامی عقائد)

اسلام چونکہ ایک فطری مذہب ہے اور اسی لئے وہ انسانی فطرت کے مطابق آسان اور سلیس زبان میں عقائد، احکام اور اخلاق کی تعلیمات پر مشتمل ہے، اسلام کی اسی فطری سادگی کے سبب علم العقائد بھی ابتداء میں انتہائی سادہ اور مختصر تھا، یعنی صاف اور سلیس زبان میں عقائد صحیحہ کا بیان تھا، فلسفیانہ مباحث کو ان میں دخل نہ تھا جیسا کہ امام ابوحنیفہؒ کی کتاب ”الفقہ الاکبر“ ملا علی قاریؒ کی کتاب ”شرح فقہ الاکبر“ علامہ نسفیؒ کی کتاب ”بحر الکلام“ اور علامہ ابوشکور السالمیؒ کی کتاب ”کتاب التمهید“ اس کی کھلی مثالیں ہیں۔

لیکن جب دوسری صدی میں خلیفہ منصور (التونی ۱۵۸ھ) کے عہد میں جب فلسفہ یونان کا، عربی میں ترجمہ ہوا تو مسلمانوں کا پہلی بار یونانی فلسفہ سے تعارف ہوا، اور ایک نیا طرز استدلال اور طریق بحث و فکر سامنے آیا اور اس کے نتیجے میں خلق قرآن جبر و قدر، رویت باری تعالیٰ وغیرہ نئے نئے مسائل وجود میں آئے۔ دینی فلسفیوں کے اس گردہ میں معتزلہ سرفہرست تھے، جو عقل پرستی میں تجاوز کر گئے تھے، چنانچہ مختلف مسائل میں معتزلہ فلسفیانہ طرز استدلال اختیار کرتے، جس سے لوگ متاثر ہوتے اور معتزلہ کی عقلیت اور تفلسف سے علماء مرعوب ہو رہے تھے، اس لئے علماء اور متکلمین نے فلسفہ ہی کی زبان اور اصطلاحات میں بحث کر کے اسلامی عقائد و نظریات کو عقلی و نقلی دلائل سے ثابت کر دیا، لیکن یہ حضرات متکلمین محدثین کے خلاف نہ تھے، بلکہ متکلمین معتزلہ کا رد، انہیں کے ہتھیاروں سے کرتے تھے۔ بہر حال اس طرح سے متاخرین کے علم کلام میں فلسفہ کی امیزش ہو گئی،

چنانچہ متاخرین کے علم کلام میں بہت ساری کتابیں لکھی گئی، جن میں علامہ تفتازانی کی کتاب 'شرح مقاصد'، شرح عقائد قاضی عضد الدین کی کتاب "مواقف"، قاضی بیضاوی کی کتاب "الطوالع والتہذیب" اور امام رازی کی کتابیں شامل ہیں، لیکن "احیاء العلوم" میں امام غزالیؒ نے کیا خوب کہا ہے: کہ علماء متکلمین کی غرض علم کلام سے یہ نہیں کہ اپنے عقائد کی تصحیح اس سے کریں ان کے عقائد کا ماخذ وہی چراغ نبوت ہے، علم کلام تو صرف معاندین کے الزام کے لئے تھا۔ متکلمین کا اپنا موقف امام ابن تیمیہؒ کے قول کے مطابق قرآن کریم کی نصرت ہی ہوتا تھا، یہ لوگوں کو قرآن و سنت سے دور رکھنے والے لوگ نہ تھے۔ اشیاء کی طبائع اور موجودات کے حقائق پر بحث کو فلسفہ کہتے ہیں، جبکہ علم الکلام صرف دینی حقائق پر بحث اور ان کے دفاع تک محدود ہے۔

اب ہم ذیل کے سطور میں مختصر علم عقائد کی تعریف، موضوع، غرض و غایت اور حالات مصنف نذر قارئین کرتے ہیں۔

تعریف علم العقائد:

هو العلم بالعقائد الدينية عن الأدلة اليقينية.

یعنی علم عقائد، اسلامی عقائد کو یقینی دلائل کے ساتھ جاننے کا نام ہے، بالفاظ دیگر اس کی تعریف یہ ہے "العلم الذي يقوم على إثبات العقائد الدينية عن طريق الأدلة العقلية"، یعنی علم کلام وہ علم ہے جس میں عقلی دلائل سے فلسفہ کے مقابلے میں اسلامی عقائد ثابت کیے جائیں۔

موضوعہ:

موضوع میں متقدمین و متاخرین کا اختلاف ہے، متقدمین کہتے ہیں: "أن موضوعه ذات الله تعالى إذ يبحث فيه عن أعراضه الذاتية - أعني صفاته الثبوتية والسلبية وعن أفعاله."

اور متاخرین کا کہنہ یہ ہے کہ: "أن موضوعه المعلوم من حيث يتعلق به

إثبات العقائد الدِّينِيَّة، لأنه يبحث في هذا العلم عن أحوال الصانع من الوجود والقدم لاعتقاد ثبوتها.

غاية:

”أن يصير الإيمان والتصديق بالأحكام الشرعية محكما.“
وغايته العظمى: ”الفوز بسعادة الدارين، الدُّنيا بالأمان،
والأخرى بالفوز بالجنان والنجاة من النيران المعدة لأهل الكفر
والطغيان.“

حالات مصنف

نام ونسب:

ابو جعفر احمد بن محمد بن سلامہ بن سلمة بن عبد المالك بن سلمہ الأزدي، الحجري، المصري، الطحاوي۔ اسم گرامی، احمد اور کنیت ابو جعفر ہے۔ الأزدي: ازہ، یمن کا ایک مشہور اور بڑا قبیلہ ہے، آپ کا تعلق چونکہ اس قبیلہ سے تھا، اس لئے ازدي آپ کی نسبت ہے۔ حجري: حجر (فتح الحاء وسكون الحميم) قبیلہ ازدي کی ایک شاخ ہے، جبکہ ازدي کی دوسری شاخ کا نام ”شنوہ“ ہے، امام طحاوی کا نسب تعلق چونکہ حجر کی شاخ سے تھا، اس لئے آپ کو حجری بھی کہا جاتا ہے۔ مصری: آپ کے آباء واجداد چونکہ فتح اسلامی کے بعد مصر میں فروکش ہو گئے تھے، اس لئے آپ کو مصری بھی کہا جاتا ہے۔ طحاوی: مصر کے ایک گاؤں ”طحاء“ میں چونکہ آپ پیدا ہوئے اس لئے آپ طحاوی کہلائے جانے لگے۔

امام طحاویؒ ایک علم و فضل کے گھرانے میں رائج قول کے مطابق ۲۲۹ھ میں پیدا ہوئے، رائج قول کے مطابق تاریخ وفات ۳۲۱ھ ہے۔ آپ کے والد محمد بھی عالم اور نہایت متقی پرہیزگار شخص تھے۔ شعر میں بھی بصیرت رکھتے تھے۔ آپ کی والدہ بھی نیک سیرت اور دیندار طبقے سے تعلق رکھتی تھیں۔
تحصیل علم:

یوں تو امام طحاویؒ نے اپنے والد گرامی سے بھی سماعت کی ہے، لیکن مستقل علم کے حصول کے لئے آپ مصر تشریف لے گئے اور وہاں جا کر ابتدائی تعلیم اپنے ماموں ابو ابراہیم اسماعیل یحییٰ مرثیٰ سے حاصل کرتے رہے، آپ کے ماموں شافعی المذہب تھے اور حضرت امام شافعیؒ کے بڑے تلامذہ میں سے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداءً امام طحاویؒ بھی شافعی

المسلک رہے، لیکن بعد میں حنفیت اختیار کر لی اور اپنے ماموں کے حلقہ درس اور مسلک کو ترک کر کے مصر میں ایک حنفی عالم امام احمد بن ابی عمران حنفی کے حلقہ درس میں شریک ہو گئے یہ حنفی عالم عراق سے تشریف لائے تھے، امام طحاوی نے ان سے باقاعدہ فقہ حنفی حاصل کرنا شروع کی، خود امام طحاوی فرماتے تھے کہ: ”میرے ماموں مسزنی فقہ حنفی کی کتب کا کثرت سے مطالعہ فرمایا کرتے تھے، انہی کی دیکھا دیکھی مجھے بھی کتب حنفیہ کے مطالعہ کا شوق ہو گیا اور میں نے بھی کتب حنفیہ کا کثرت سے مطالعہ کر دیا جس کا اثر یہ ہوا کہ مطالعہ کے بعد مجھے حنفیہ کے دلائل شافعیہ کے دلائل کے مقابلہ میں زیادہ مضبوط اور محقق نظر آئے، چنانچہ حنفی مسلک اختیار کرنے کی وجہ یہی بنی۔“

سماع حدیث کے لئے سفر:

امام طحاویؒ نے امام مزنیؒ اور اپنے والد گرامی کے علاوہ مصر کے دیگر محدثین و فقہاء کی خدمت میں بھی حاضر ہو کر فقہ و حدیث کے علم کو حاصل فرمایا، بلکہ مصر میں ہر وارد ہونے والے محدث و عالم کی خدمت میں حاضر ہو کر استفادہ فرماتے تھے۔ درحقیقت امام طحاویؒ کے شیوخ میں مصری، مغاربہ، یمنی، بصری، کوئی، حجازی، شامی اور خراسانی، مختلف ممالک کے حضرات ہیں، جن سے آپ نے اخبار و آثار کا علم حاصل کیا، اس لئے امام طحاویؒ کے شیوخ و اساتذہ بے شمار ہیں۔ آپ ایک واسطہ یعنی امام مزنیؒ کے واسطے سے، امام شافعی رحمہ اللہ کے شاگرد ہیں، اور دو واسطوں سے، امام مالکؒ و امام محمدؒ کے شاگرد ہیں، اور تین واسطوں سے امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد ہیں۔

علوم حاصل کرنے کے بعد آخر وہ وقت آیا کہ اپنے زمانہ میں تحقیق مسائل اور وقت نظر کے لحاظ سے امام طحاویؒ کا کوئی مثل نہ رہا۔ امام طحاویؒ کے علمی کمالات نے آپ کی ذات گرامی کو طالبان حدیث و فقہ کا مرجع بنا دیا تھا، اختلاف مذہب و مشرب کے باوجود، دور دراز سے طالبان علوم، سفر کی صعوبتیں اٹھا اٹھا کر علمی استفادہ کے لئے آپ کے پاس آتے تھے۔

امام طحاوی کا علمی مقام:

قافلہ علم میں بہت کم ایسے حضرات نکلیں گے، جو بیک وقت حدیث وفقہ اور اصول فقہ میں امام طحاویؒ کے علمی مقام تک پہنچے ہو، امام طحاویؒ کو ”أعلم الناس بمذهب أبي حنيفة“ کہا گیا۔ امام طحاویؒ حفظ حدیث کے ساتھ ساتھ اجتہاد میں بھی بہت بلند مقام رکھتے تھے، حضرت شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ: ”امام طحاوی مجتہد منتسب تھے، محض امام ابوحنیفہؒ کے مقلد نہ تھے، کیونکہ آپ نے بہت سے مسائل میں ابوحنیفہ کے مذہب سے اختلاف کیا ہے۔“

امام طحاویؒ کے ہم عصر محدثین:

امام طحاویؒ کا زمانہ تیسری صدی ہجری ہے اور جتنے مصنفین صحاح ستہ کے ہیں، سب تیسری صدی ہجری کے ہیں، چنانچہ حضرت امام بخاری، امام مسلم، امام احمد بن حنبل، ترمذی ابو داؤد، امام یحییٰ بن معین، نسائی، ابن ماجہ رحمہم اللہ تعالیٰ، یہ سب ائمہ حدیث جو کہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، امام طحاوی رحمہ اللہ کو ان کے ہم عصر ہونے کا شرف حاصل رہا۔ جن اساتذہ سے امام نسائی، امام ابن ماجہ اور امام مسلم رحمہم اللہ نے پڑھا ہے، ان میں سے بعض اساتذہ سے امام طحاویؒ نے بھی پڑھا ہے۔

تصانیف:

امام طحاویؒ کی مشہور تالیفات یہ ہیں۔

- (۱) ”مشکل الآثار“ جس کا اصلی نام ”مشکل الحديث“ ہے۔
- (۲) عالمیہ (دورہ حدیث) میں داخل درس، معانی الآثار جو کہ متن ہے، جبکہ اس کی شرح ”شرح معانی الآثار“ کے مصنف عبدالقادر القرشی (المتوفی ۵۷۷ھ) ہیں۔ (۳)
- مختصر الطحاوي في الفقه الحنفي“ (۴) ”سنن الشافعي“ (۵) ”عقيدة الطحاوية“ وغیرہ۔

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ

هذا ما رواه الإمام أبو جعفر الطحاوي في ذكر بيان اعتقاد أهل السنة والجماعة على مذهب فقهاء الملة أبي حنيفة النعمان بن ثابت الكوفي وأبي يوسف يعقوب بن إبراهيم الأنصاري وأبي عبد الله محمد بن الحسن الشيباني رضوان الله تعالى عليهم أجمعين وما يعتقدون من أصول الدين ويدينون به لرب العالمين.

یہ (ماحضر فی الذہن) وہ تحریر ہے جس کو شیخ امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے روایت کی ہے، اہل سنت والجماعت کے اس عقیدہ کے تذکرہ کے سلسلے میں جو ملت اسلامیہ کے فقہاء (امام ابو حنیفہ نعمان بن ثابت الکوفی رحمۃ اللہ علیہ، ابو یوسف یعقوب بن ابراہیم الانصاری رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابی عبد اللہ محمد بن الحسن الشیبانی رحمہم اللہ) کے عقیدہ کے مطابق ہے، اور ان اصول دین (عقائد) کے تذکرہ کے سلسلے میں بیان ہوگا، جن کا یہ حضرات عقیدہ رکھتے ہیں اور رب العالمین کے لئے جس کو وہ اپنا دین بنائے ہوئے ہیں۔

هَذَا: ما حضر في الذهن کی طرف اشارہ ہے۔ مَا: بمعنی الذي۔

الإمام: وہ عالم جس کی اقتداء کی جائے۔ (مصباح اللغات)

هذا ما رواه: عبارت کے شروع کا یہ حصہ یا تو امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کے کسی شاگرد نے بطور الحاق کے ذکر کیا ہے، کیونکہ اہل اللہ اپنی تعریف و توصیف بیان کرنے سے گریز کرتے ہیں اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عبارت خود امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی ہو، تجدید بالنعمة کے طور پر اپنی ذات کے لئے تعریفی کلمات استعمال کیے۔

السنة: أى السيرة والطريقة المحمدية۔ والجماعة: أى أهل الجماعة

من الصحابة والتابعين ومن بعدهم، من المتبعين للنبي ﷺ. فقهاء الملة: مبدل منه، أبي حنيفة بدل ہے۔ وما يعتقدون کا، ”فی ذکر بیان“ میں ”بیان“ پر عطف ہے ای فی ذکر ما يعتقدون۔ ویسیدون بہ کا عطف وما يعتقدون پر عطف تفسیری ہے، کیونکہ دین بنانا اور عقیدہ رکھنا دونوں کا حاصل ایک ہی ہے۔

توحید

قال الإمام وبه قال الإمامان المذكوران رحمهما الله تعالى: نقول في توحيد الله معتقدين بتوفيق الله: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى واحد لا شريك له. امام اعظم ابوحنيفه رحمه الله عليه اور صاحبين (امام ابو يوسف رحمه الله عليه اور امام محمد رحمه الله عليه) فرماتے ہیں کہ: توفیق الہی کا عقیدہ رکھتے ہوئے توحید باری تعالیٰ کے متعلق ہم (عقیدتاً) یہ کہتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ ایک ہے اس کا کوئی شریک نہیں۔

قال الإمام: امام ابوحنيفه رحمه الله عليه نے فرمایا: وبه: ای بقول الإمام۔ الامامان المذكوران: صاحبین۔

معتقدین: یہ نقول کی ضمیر فاعل سے حال ہے، اعتقاد سے مشتق ہے، اعتقد الامر: نہایت پختہ یقین رکھنا۔

عقیدہ کی تعریف

العقيدة ما يقصد فيه نفس الاعتقاد دون العمل. (التعريفات: ۸) عقیدہ وہ ہے۔ جس پر پختہ یقین کیا جائے، جس کو انسان اپنا دین بنائے اور اس کا اعتقاد رکھے، عقیدہ ہی تمام دین کی اساس اور جڑ ہے۔

التوفيق

جعل الله تعالى قول العبد وفعله موافقاً لأمره ونهيه. اللہ تعالیٰ جب بندہ کا قول اور فعل اپنے امر اور نہی کے موافق بنادے، بس یہی توفیق ہے۔

توفیق کی مشہور تعریف بالفاظ دیگر یہ ہے ”جعل الأسباب نحو المطلوب الخیر“ (دستور العلماء) نقول فی توحید اللہ الخ کا مطلب یہ ہوا کہ الاعتقاد بتوفیق من اللہ تعالیٰ لنا، لا بقوتنا یعنی ہم اللہ کی توفیق کے سہارے پر اللہ کی توحید کے بارے میں بیان شروع کر رہے ہیں۔

نوٹ:- ”إن اللہ“ سے لیکر کتاب کے آخر تک یہ نقول کا مقولہ ہے، پھر ”نقول“ اپنے مقولہ سے مل کر مقولہ ہوا، مصنف کے قول ”قال الإمام“ کا۔

”لا شریک لہ“ ”واحد“ کی تشریح ہے یعنی ”وحدانیت“ ایک سببی صفت ہے، جو تین انواع، وحدۃ فی الذات، وحدۃ فی الصفات اور وحدۃ فی الافعال پر بولا جاتا ہے ای لا شریک لہ فی ذاته ولا فی صفاته ولا فی أفعاله۔ ”واحد“ کا استعمال ”أحد“ کے معنی میں ہے، یعنی یکتا ولا ثانی، اسماء حسنیٰ میں اسی معنی کے لحاظ سے ہے۔

(مصباح اللغات)

اللہ کے واحد ہونے کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ شانہ کی ذات قابل تجزی نہیں، نہ صفات میں کوئی اس کا نظیر ہے نہ افعال میں کوئی اس کا شریک ہے۔ (مرقاۃ، شرح مشکوٰۃ، بیان الفوائد: ۱۵۵)

التوحید: مصدر ہے، باری تعالیٰ کی وحدانیت کا اعتقاد۔

توحید کی اہمیت

عقیدہ توحید، اسلام کا سب سے پہلا بنیادی عقیدہ ہے، یہی عقیدہ دین کی اصل بنیاد ہے، کیونکہ توحید ایک بدیہی اور فطری امر ہے، یوں تو شرح صدر کے بہت سے اسباب ہیں، مگر شرح صدر کا سب سے قوی اور اہم سبب توحید ہے۔ (زاد المعاد)

حقیقی اور خالص توحید کا فخر صرف اسلام کو حاصل ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا اصل مقصد توحید ہے، تمام انبیاء کا سب سے پہلا اور اہم سبق اللہ کی توحید ہے، یہی وجہ ہے کہ تمام انبیاء و مرسلین کا اجماع عقیدہ توحید پر رہا ہے، فرمایا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَسُولٍ إِلَّا نُوحِيْ إِلَيْهِ أَنَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا أَنَا فَاعْبُدُونِ﴾ [انبیاء: ۲۵] قرآن عظیم میں

پونے دو سو آیات اور سو احادیث نبویہ میں عبادت کو صرف ایک اللہ کا خاصہ بتلایا گیا ہے۔ توحید کی اہمیت کا اندازہ اس امر سے لگایا جاسکتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے نبوت کے بعد کی زندگی میں صرف توحید سمجھانے کے لئے تیرہ برس صرف کئے اور مدنی زندگی میں باقی شریعت کے لئے دس سال لگائے۔

ولا شئیء مثله ولا شئیء یُعجزه ولا إله غیره .
 نہیں ہے اس کی طرح کا سا کوئی (اس جیسی کوئی چیز نہیں) اور کوئی چیز اللہ کو عاجز نہیں کر سکتی اور اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں۔

ولا شئیء مثله: باری تعالیٰ کے اس قول: ﴿لَیْسَ کَمِثْلِهٖ شَیْءٌ وَهُوَ السَّمِیْعُ الْبَصِیْرُ﴾ کی طرف اشارہ ہے، نیز ماقبل صفت وحدت کی تاکید ہے، کیونکہ مثل کا نہ ہونا وحدت کی دلیل ہے۔ اگر اللہ کا مثل ہوتا، تو پھر اللہ واحد بھی نہ ہوتا۔ حاصل یہ کہ نہ ذات میں اس کا کوئی مماثل ہے، نہ صفات میں، نہ افعال میں، بے شک وہ ہر چیز کو دیکھتا، سنتا ہے، مگر اس کا دیکھنا سننا بھی مخلوق کی طرح نہیں، جس کی کیفیت بیان کی جاسکے۔ وہ مخلوق کی مشابہت و مماثلت سے بالکل پاک اور مقدس و منزہ ہے، پھر اس کی صفات کی کیفیت کس طرح سمجھ میں آجائے۔ (مخص از فوائد عثمانیہ)

اللہ کی ذات و صفات کو اپنی ذات و صفات پر قیاس کرنا، نادانی ہے، اللہ کی ذات و صفات کے متعلق زیادہ بحث و تفتیش کرنا اس کی کیفیتوں میں غور و خوض کرنا کج فہمی کی دلیل ہے، غرضیکہ اللہ تعالیٰ علیم وخبیر و بصیر ہے، مگر ہماری طرح نہیں، بدون مضغہ لحم کے ادراک کرتا ہے اور بغیر کان کے سنتا ہے اور بغیر آنکھ کے دیکھتا ہے بدون زبان کے کلام کرتا ہے ہماری طرح ان اعضاء و جوارح کے محتاج نہیں، ”لا شئیء مثله“ سے مشبہ و معطلہ کی تردید ہے۔

ولا شئیء یُعجزه: عجز اہل سنت کے ہاں امر و جودی ہے، جو قدرت کی ضد ہے، ارشاد باری ہے: ﴿وَمَا كَانَ لِلّٰهِ لَیْعُزَّهٖ مِنْ شَیْءٍ فِی السَّمٰوٰتِ وَلا فِی الْاَرْضِ اِنَّهٗ كَانَ عَلِیْمًا قَدِیْرًا﴾ (فاطر: ۴۴)

اللہ تعالیٰ ایسا نہیں ہے کہ کوئی چیز (قوت والی) اس کو عاجز کر سکے، نہ آسمان میں اور نہ زمین میں (کیونکہ) وہ بڑے علم والا اور بڑی قدرت والا ہے، پھر معاذ اللہ عاجز ہو تو کدھر سے ہو۔

ولا إله غيره : ولا إله أي في الوجود - إله بوزن فعّال بمعنى اسم مفعول مأثورة کے ہیں، یعنی معبود، ہر قوم کے نزدیک جس کی بندگی کی جائے وہ اللہ ہے، خواہ معبود برحق ہو یا معبود باطل، اس جملے میں کلمہ توحید ”لا إله الا الله“ کی طرف اشارہ ہے۔

قديم بلا ابتداء، دائم بلا انتهاء، لا يفنى ولا يبدا.
اللہ تعالیٰ ایسا قدیم ہے، جس کی ابتدا نہیں اور ہمیشہ رہنے والا ہے، جس کی انتہاء نہیں وہ ذات نہ فنا ہوگی اور نہ ہی ختم ہوگی۔

قديم: صفت سلبیہ ہے، کیونکہ قدیم کا معنی ہے، ایسا موجود جس کی بدايت نہ ہو، قدیم اور ازل میں پھر فرق یہ ہے کہ قدیم ازل سے اخص ہے، کیونکہ قدیم کی تعریف ہے ”موجود لا أول له“ ازل کی تعریف ہے ”مالا اول له اعم من أن يكون وجوديا كذات مولنا عز وجل او عدما كعدمنا الأزلّي“۔

بلا ابتداء: کا مطلب ہے، کہ مسبوق بالعدم نہ ہو۔ دائم: أي باق۔ بلا انتهاء: یعنی اس پر عدم کا طاری ہونا محال ہے، ”لأن من ثبت قدمه امتنع عدمه“ دائم بلا انتهاء: سے صفت بقاء مراد ہے اور یہ بھی صفت سلبیہ ہے، کیونکہ اس کا حاصل یہ نکلا ”باق ليس ملحقا بعدم“ اگلی عبارت ”لا يفنى ولا يبدا“ اسی صفت بقاء کی تفسیر و تاکید ہے۔ لا يفنى (س، ض) فناء ۱: معدوم ہونا۔ يقال: فنى الميت، اذا زال وذهب أثره ”یہاں معنی ہے ”آئی لایزول بقاء ہ“

ولا يبدا: باد بید بیداً وبيدودة: ہلاک ہونا، يقال بادت القبيلة : اذا انقطعت : یہاں مراد ہے ”آئی لایسقط بقاءہ“ دراصل فناء اور بید متقارب المعنی ہیں۔ جو تاکید کے لئے ہیں۔

فائدة: ”قديم بلا ابتداء، دائم بلا انتهاء“ کا مفہوم اللہ کے اس ارشاد میں

ہے۔ ﴿وہو الاول والاخر﴾ (الحديد: ۳)

یہی مفہوم مسلم شریف کی حدیث میں بھی ہے: ”اللّٰہم أنت الاول فلیس قبلک شیءٌ وأنت الآخر فلیس بعدک شیءٌ“ (رقم الحدیث: ۲۷۱۳) واضح رہے کہ ”قدیم“ بھی ”اول“ کے معنی میں ہے، اگرچہ لفظ قدیم کا اطلاق اللہ تعالیٰ پر قرآن وحدیث میں وارد نہیں، مگر اس کے باوجود اللہ پر اس کا اطلاق اس لئے درست ہے کہ اس کا اطلاق اجماع سے ثابت ہے اور اجماع کا حجت ہونا قرآن سے ثابت ہے۔ (شرح العقائد)

لفظ موجود، واجب اور لفظ خدا کا اطلاق بھی اسی قبیل سے ہے۔

ولا یكون إلا ما یرید.

اور نہیں ہوتا ہے، مگر وہی جس کا اللہ ارادہ کرتا ہے۔

ارادہ کی تعریف

ولا یكون: أي ولا یوجد فی ملکہ إلا ما یرید، وهذا ما اشتہر من السلف: أن ما شاء اللہ کان وما لم یشاء لم یکن۔ ارادہ کی تعریف یہ ہے کہ ارادہ ”أحد المقدورین“ کے وقوع کو ترجیح دینے والی صفت کا نام ہے مثلاً اللہ تعالیٰ حامد کو لڑکا دینے پر قادر ہے اور نہ دینے پر بھی قادر ہے، یعنی اگر چاہے تو دے اور اگر نہ چاہے تو نہ دے، تو جب لڑکا دینا اور نہ دینا دونوں اللہ کا مقدور تھا، پس جس چیز نے دینے کو، نہ دینے پر ترجیح دی، وہی ارادہ ہے اور اس کو مشیت بھی کہتے ہیں، کیونکہ ارادہ اور مشیت دونوں ایک ہی صفت ہیں، غرضیکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ کے ارادہ سے ہی ہوتا ہے ازل میں جو کچھ ارادہ کر لیا تھا اب اسی کے مطابق ہو رہا ہے اور انما اسی کے مطابق ہوتا رہے گا۔ ﴿فَعَالٌ لِّمَا یرید﴾ (البروج) جو ارادہ کرتا ہے، مگر گزرتا ہے۔ تمام افعال عباد، اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے واقع ہوتے ہیں، خواہ وہ افعال از قبیل خیر ہوں یا از قبیل شر ہوں (کوئی چیز بھی اللہ کے ارادہ و اختیار سے باہر نہیں) البتہ معتزلہ اور قدریہ کا کہنا یہ ہے کہ افعال قبیحہ اللہ تعالیٰ کے ارادہ سے صادر نہیں ہوتے، ان کا اصول یہ ہے ”إرادة القبیح قبیح“ ہمارا اصول یہ ہے کہ ارادہ قبیح، قبیح نہیں، بلکہ

کسب القبیح، قبیح، نیز ارادہ رضا کو بھی مستلزم نہیں، مثلاً کافر سے کفر ہی کا ارادہ اللہ نے کیا، یعنی اللہ نے ارادہ کیا کہ فلاں سے اختیاری طور پر کفر صادر ہوگا، مگر اس فلاں کے کفر پر راضی نہیں۔

لاتبلغه الأوهام ولا تدركه الأفهام.

انسانی خیالات اور ادہام اس کی حقیقت تک نہیں پہنچ سکتے اور نہ ہی عقول انسانی اس کا ادراک کر سکتی ہیں۔

اوهام: کا مفرد وہم ہے، دل میں جو خطرہ گزرے اس کو وہم کہتے ہیں۔ قال فی الصحاح: توهمت الشيء ظننته: میں نے خیال و گمان کیا أفهام، فہم کی جمع ہے۔ فہمت الشيء أي علمته: میں سمجھ گیا، أي لا ينتهي إليه وهم ولا يحيط به علم۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور حقیقت سب کے تخیلات اور عقول سے بالاتر ہے، بندوں کا علم اس کو محیط نہیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا﴾ (ط: ۱۱۰) وہم اور علم سے اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں ہو سکتا، البتہ اللہ تعالیٰ کی معرفت، صفات الہیہ سے ہوتی ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں ”ترقي من الأدنى إلى الأعلى“ ہے، کیونکہ جب عقل انسانی قاصر ٹھہری، تو قوت و ہمیہ اور قوت متخیلہ کا بدرجہ اولیٰ بحر معلوم ہو گیا۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم و زہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم

دفتر تمام کشت و پایاں رسید عمر ما بچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

وَلَا يُشَبَّهُهُ الْأَنْامُ.

مخلوق میں سے کوئی اس کا مشابہ نہیں۔

الأنام: أي المخلوقات۔ وهو اسم جمع لا واحد له من لفظه۔ فرقہ مشبہہ کے لوگ اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیتے ہیں اور اس کے لئے جسم اور جہت کو ثابت کرتے ہیں ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ: مخلوق کے اجسام کی طرح اللہ تعالیٰ بھی اپنے لئے خون، گوشت اور ہڈیوں کا جسم رکھتے ہیں اور بعض نے کہا کہ: اللہ کا جسم تو ہے، مگر

مخلوق کے اجسام کی طرح خون اور گوشت سے مرکب نہیں ہے، ”لَا يُشَبِّه الْأَنَامَ“ سے مصنف رحمۃ اللہ علیہ نے فرقہ مشبہ کی تردید کی۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال میں کوئی بھی شئی اللہ کا مماثل اور مشابہ نہیں۔ ”الفقہ الاکبر“ میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا کلام اس سلسلے میں اور زیادہ واضح ہے، آپ فرماتے ہیں: ”لَا يُشَبِّه شَيْئًا مِنْ خَلْقِهِ وَلَا يُشَبِّههُ شَيْءٌ مِنْ خَلْقِهِ“ یعنی اللہ تعالیٰ کسی بھی مخلوق سے مشابہت نہیں رکھتا اور نہ ہی کوئی مخلوق اس سے مشابہت رکھتی ہے۔ آگے فرمایا: ”وَصِفَاتُهُ كُلُّهَا خِلَافٌ صِفَاتِ الْمَخْلُوقِينَ يَعْلَمُ لَا كَعِلْمِنَا وَيَقْدِرُ لَا كَقُدْرَتِنَا وَيُرِي لَا كَرُؤْيَيْنَا“، غرضیکہ صرف اسی اشتراک تو ہے، کیونکہ انسان بھی دیکھنے سننے والا ہے، لیکن اللہ کا سنا دیکھنا ذاتی، لاحدود اور پائیدار ہے، جبکہ انسان کا ایسا نہیں۔

حی لا یموت، قیوم لا ینام۔

اللہ تعالیٰ ایسا زندہ ہے، جس کو کبھی موت نہیں آسکتی، ایسا سنبھالنے والا ہے تمام عالم کا، جس کو کبھی نیند نہیں آسکتی۔

حی: کے معنی ہیں زندہ، زندگی کی صفت اللہ کے لئے ثابت ہے دائماً، کمالات و جود یہ میں سب سے پہلے حیات ہے۔ اسماء الہیہ میں سے یہ لفظ لا کر یہ تزلانا مقصود ہے کہ وہ حقیقی زندگی کا مالک ہے وہ ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے وہ موت سے بالاتر ہے۔ ”وَمَا أَن حَيَاتِهِ أَزَلِيَّةٌ فَهِيَ أَبَدِيَّةٌ كَمَا نَصَّ عَلَيْهَا بِقَوْلِهِ: ”لَا یموت“۔

قیوم: صیغہ مبالغہ۔ ”قائم“ سے، ”قیام“ بروزن فیعال اور قیوم بروزن

فیعل مبالغہ کے صیغے ہیں، ان کے معنی ہیں۔ ”القائم بنفسه المقيم لغيره بالتدبير والحفظ“ یعنی وہ جو خود قائم رہ کر دوسروں کو قائم رکھتا اور سنبھالتا ہے۔ ”قیام“ سے زیادہ مبالغہ ”قیوم“ کے اندر ہے، اس لئے کہ واو، الف سے اقویٰ ہے۔ ”قیوم“ حق تعالیٰ کی خاص صفت ہے، جس میں کوئی مخلوق شریک نہیں ہو سکتی، اس لئے کسی انسان کو ”قیوم“ کہنا جائز نہیں، جو لوگ عبد القیوم کے نام کو بگاڑ کر صرف قیوم بولتے ہیں گنہگار ہوتے ہیں۔

(معارف القرآن ج ۱، ص ۶۱۳)

حی: سے خدا کا واجب الوجود ہونا بیان کیا، یعنی بذاتہ اور بنفسہ وہ واجب

الوجود ہے اور ”قیوم“ سے خدا کا و اھب الوجود ہونا بیان کیا، یعنی دوسروں کو وجود اور حیات، ہمہ اور عطا کرنے والا ہے۔

لاینام: کمال حیات اور کمال قیومیت کی دلیل ہے، کیونکہ جس کو تعب، اونگھ اور نیند لاحق ہوتی ہے وہ پھر ”غیر تام الحیات ناقص الحفظ والقیام“ ہوگا۔

خالق بلا حاجة رازق بلا مؤنة.

بغیر کسی اپنی ضرورت اور حاجت کے اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا خالق ہے وہ بغیر کسی کلفت و مشقت کے ان کا رازق ہے۔

خالق: أي لجميع خلقه بلا حاجة إليهم. رازق: أي لهم، فضلاً منه. بلا مؤنة: ثقله. المؤنة. خوراك تختي بوجه: ج مؤن ارشاد ہے: ﴿وما أريد منهم من رزق وما أريد ان يطعمون﴾ (الذاریات: ۵۸، ۵۶) ﴿والله الغني وأنتم الفقراء﴾ (محمد: ۳۸) ﴿وهو يطعم ولا يطعم﴾ (الانعام: ۱۴) حاصل یہ کہ حاجت، مؤنة یہ سب کمزوری اور نقص کی علامات ہیں۔ واللہ

تعالیٰ منزہ عنہ

مُمِيتٌ بلا مُخَافَةٍ، باعث بلا مشقّة.

(وقت مقررہ پر) وہ سب کو موت دینے والا ہے، بغیر کسی خوف کے، مرنے کے بعد دوبارہ اٹھانے والے ہیں، بغیر کسی دشواری کے۔

مُمِيتٌ: من الإماتة، موت دینے والا ہے۔ مُخَافَةٍ: (س) خوفاً وخيفاً ومُخَافَةٍ: گھبرانا۔ المَشَقَّة: بفتح الميم وکسرها: دشواری، محنت ج: مشاق ومَشَقَّات.

نوٹ: فلاسفہ موت کو ”عدمی“ سمجھتے ہیں، حالانکہ موت وجودی ہے۔ قال اللہ تعالیٰ: ﴿الذي خلق الموت والحياة﴾ (الملك: ۲) عدمی چیز کیونکر مخلوق ہو سکتی ہے؟ پتہ چلا کہ موت وجودی ہے۔

ما زال بصفاته قديمًا قبل خلقه لم يزدْ ذُ بكونهم شيئاً لم يكن قبلهم من صفاته، وكما كان بصفاته أزليًا كذلك لا يزال عليها أبدًا. اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق سے قبل، اپنی صفات (صفات ذات، صفات فعل) کے ساتھ ہمیشہ سے قدیم رہا، مخلوق کے وجود کے سبب سے اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے کسی ایسی نئی صفت کا اضافہ نہیں ہوا، جو صفت مخلوق کے وجود سے پہلے نہ ہو۔ جیسے وہ اپنی صفات میں ازلی تھا، ایسے ہی ہمیشہ انہیں صفات کے ساتھ موصوف رہے گا۔

ما زال بصفاته: ”ما زال“ افعال ناقصہ میں سے ہے۔ ”قدیمًا“ اس کی خبر ہے۔ ”من صفاته“ صفات کی دو قسمیں ہیں: صفات ذات اور صفات افعال۔ صفات ذات، ان صفات کو کہتے ہیں: جن کی ذات باری تعالیٰ سے نفی، جہل کو اور قدرت کی نفی، عجز کو مستلزم ہو اور جہل و عجز دونوں از قبیل نقائص ہیں اور صفات افعال، ان صفات کو کہتے ہیں جن کی ذات واجب سے نفی موجب نقص نہ ہو۔ مثلاً اعزاز، اذلال اور اغناء وغیرہ یہاں مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ صفات کمال (صفات ذات و صفات افعال) کے ساتھ ہمیشہ سے ہے، ہمیشہ رہے گا۔ مخلوق کو پیدا کرنے کے بعد اس کے کسی وصف میں اضافہ نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ کے ثبوت میں مخلوق کا کوئی دخل نہیں ہے۔ بہر حال جیسے ذات باری تعالیٰ ازلی ابدی ہے ایسے ہی صفات باری تعالیٰ بھی ازلی اور ابدی ہیں ورنہ صفات کا ذات باری سے انفکاک لازم آئے گا۔

ما زال بصفاته.....: سے دراصل معتزلہ، جہمیہ اور بعض اہل تشیع وغیرہ کی تردید ہے، جن کا خیال یہ ہے کہ: ”إنه تعالى صار قادرًا على الفعل والكلام بعد أن لم يكن قادرًا عليه لأنه صار الفعل والكلام ممكنًا بعد أن كان ممتنعًا“

لَيْسَ مُنْذُ خَلْقِ الْخَلْقِ اسْتِفَادَ اسْمَ الْخَالِقِ وَلَا بِأَحْدَاثِهِ الْبَرِيَّةِ
استفاد اسم الباري.

مخلوق کو پیدا کرنے اور وجود میں لانے کے بعد اللہ تعالیٰ کا نام خالق نہیں
پڑا (بلکہ وہ مخلوق کو وجود بخشنے سے پہلے بھی خالق تھا) اور مخلوق کو ایجاد کرنے کی وجہ
سے اس نے اپنا نام ”باری“ نہیں پایا (بلکہ وہ پہلے سے بھی ”باری“ ہے)

یوں تو ”خالق“ اور ”باری“ دونوں لفظ ہم معنی ہیں، البتہ جب دونوں ایک
ساتھ استعمال ہو تو ان میں فرق کیا جاسکتا ہے، چنانچہ امام غزالی فرماتے ہیں کہ: خالق کے
معنی مقدر کے ہیں، یعنی اندازہ مقرر کرنے والا اور باری کے معنی ہیں محدث اور موجود
کے، یعنی وجود میں لانے والا۔ (۲) قاضی بیضاوی کے نزدیک ”خالق“ کے معنی عام ہیں
اور ”باری“ کے معنی خاص ہیں، کیونکہ ”خالق“ مطلقاً موجود کو کہتے ہیں (خواہ تفاوت ہو یا نہ
ہو) اور ”باری“ بغیر کسی تفاوت و فرق کے پیدا کرنے والے کو کہتے ہیں۔ بہر حال حاصل یہ
کہ ایسا نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جب سے مخلوق بنائی تو خالق کا نام اسے حاصل ہوا اور نہ ہی
خلقت کو پیدا کرنے سے ”باری“ اور پیدا کرنے والا نام اسے حاصل ہوا، بلکہ اللہ تعالیٰ مخلوق
کو وجود میں لانے اور اسے پیدا کرنے سے پہلے بھی ”خالقیت“ اور ”بارئیت“ کے ساتھ
متصف تھے، کیونکہ اگر یہ صفت ازلی نہ ہو تو لازم آئے گا کہ مخلوق کی تخلیق کے بعد اللہ تعالیٰ کو
صفت خالقیت حاصل ہوئی اس سے قبل گویا اللہ تعالیٰ اس کی ضد (عدم خالقیت) سے
متصف تھے۔ تعالیٰ اللہ عن ذلک.

له معنى الربوبية ولا مربوب ومعنى الخالقية ولا مخلوق.
اللہ کے لئے ”ربوبیت“ کی صفت، یعنی پالنے کی صفت اس وقت بھی ہے،
جبکہ ”مربوب“ پلنے والا موجود نہ ہو اور اس کے لئے خالقیت کی صفت اس وقت
بھی ہے، جبکہ مخلوق موجود نہ ہو۔

الحاصل مربوب: کے وجود سے پہلے بھی اللہ تعالیٰ ”رب“ کے ساتھ موصوف

ہیں اور مخلوق کے وجود سے قبل بھی ”خالق“ کے ساتھ متصف ہیں۔

و كما أنه مُحيي الموتى بعد ما أحياهم، استحقَّ هذا الاسم قبل إحياءهم، كذلك استحقَّ اسم الخالق قبل إنشائهم.
جیسا کہ وہ مردوں کو زندہ کرنے کے بعد ”مُحیی“ (زندہ کرنے والا) کہلاتا ہے، اسی طرح وہ زندہ کرنے سے پہلے بھی اس نام کا مستحق ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کرنے اور ان کو وجود بخشنے کے بعد ”مُحیی“ (زندہ کرنے والا) کی صفت سے موصوف ہیں، اسی طرح وہ زندہ کرنے سے قبل بھی اسی نام سے موصوف تھا۔ مثال سے اس کو اس طرح سمجھیں کہ ”کاتب“ اس کو کہتے ہیں جو لکھے، مگر جو اس وقت نہیں لکھ رہا ہے، لیکن اس میں ”کاتب“ کا ملکہ اور استعداد ہے، پھر بھی اس کو کاتب کہتے ہیں، یہی حال قاری اور مدرس کا ہے۔

ذلك بأنه على كل شيء قدير، وكل شيء إليه فقير وكل أمر عليه يسير لا يحتاج إلى شيء، ليس كمثله شيء، وهو السميع البصير.
یہ اس لئے کہ وہ ہر چیز پر قادر ہے اور ہر چیز اس کی محتاج ہے، ہر کام اس کے لئے آسان ہے وہ کسی چیز کا محتاج نہیں اس کی کوئی مثال نہیں وہ سننے والا اور دیکھنے والا ہے۔

ذلك: أي ثبوت صفاته في الأزل قبل خلقه۔ یہ بات عجیب سی معلوم ہو رہی تھی کہ ساری صفات باری ازلی ہیں اور مخلوق کی تخلیق سے پہلے ہی وہ ”خالق“ ہے۔ ”ذلك“ سے اس تعجب کو ختم کیا جا رہا ہے۔

بأنه: أي بسبب أنه على كل شيء قدير:

عزله کا خیال یہ ہے کہ: جس چیز پر بندہ کو قدرت ہے، بعینہ اس چیز پر اللہ تعالیٰ کو قدرت نہیں، اس جملے سے ان کی تردید ہو رہی ہے، کیونکہ اہل سنت کے ہاں اللہ ہر شئی پر قادر ہے، چنانچہ ہر ممکن اللہ کا مقدور ہے۔ جہاں تک تعلق ہے محال لذاتہ کا مثلاً ”کون الشيء الواحد موجوداً ومعدوماً في حال واحدة“ تو وہ باتفاق عقلاء، شيء نہیں کہلاتا، لہذا تحت القدرة بھی داخل نہیں، ”ومن هذا الباب خلق مثل نفسه

وإعدام نفسه وأمثال ذلك من المحال... ”یہاں معدوم ممکن کے بارے میں اختلاف ہے کہ وہ ”شیء“ ہے یا نہیں؟ لیکن تحقیق یہ ہے کہ: ”أن المعدوم الممكن، ليس بشيء في الخارج ولكن الله يعلم ما يكون قبل أن يكون، ويكتبه وقد يذكره ويُخبر به، فيكون شيئاً في العلم والذكر والكتاب لا في الخارج“۔

ولا يحتاج إلي شيء: ”ويعتاج إليه كل شيء، مثلاً ﴿إِنْ زُلْزِلَ السَّاعَةُ شَيْءٌ عَظِيمٌ﴾ اب قیامت کا زلزلہ خارج کے اعتبار سے کوئی شئی نہیں، لیکن علم الہی میں شئی ہے غرضیکہ اللہ تعالیٰ محتاج الیہ ہے محتاج نہیں ہے۔

ليس كمثله شيء: بظاہر اللہ کی مثل کی مثل کی، نفی ہو رہی ہے، حالانکہ اصلاً اللہ تعالیٰ کی مثل ہی نہیں، اس اشکال کے جواب میں اکثر کا خیال تو یہ ہے کہ (۱) کاف برائے تاکید زائد ہے والمعنى ليس مثله شيء. (۲) کاف کو زائد قرار دینا خلاف الاصل ہے، بلکہ مثل بمعنی وصف کے ہیں، أي ليس كـ وصفه شيء یا مثل بمعنی ذات کے ہیں أي ليس كذاته شيء. (۳) یا ظاہری معنی ہی مراد لیا جائے، مگر یہ پھر مبالغے پر محمول ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ بالفرض اگر اللہ کی مثل ہو تو اس کی بھی مثل نہیں چہ جائیکہ اللہ کی مثل ہو۔

ليس كمثله شيء: سے مشبہہ کی تردید ہوگئی، وهو السميع البصير: سے معطلہ کی تردید ہے۔ فهو تعالى موصوف بصفات الكمال، وليس له فيها شبهة فالمخلوق وإن كان يوصف بأنه سميع بصير، فليس سمعه وبصره كسمع السرب وبصره. اتنی زبردست قوت سماعت کے باوجود اللہ تعالیٰ کانوں سے پاک ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو دیکھتا ہے، لیکن وہ مخلوق جیسی آنکھوں سے پاک ہے۔

خلق الخلق بعلمه وقدر لهم أقداراً وضرب لهم أجالاً.
اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اس حال میں پیدا کیا کہ اللہ کو مخلوق کا علم تھا اور اللہ تعالیٰ نے مخلوق کی تقدیریں مقرر کیں، اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے لئے موتیں (آخری وقت) مقرر کیں۔

خلق: أي أوجد وأنشأ وأبدع الخلق: أي المخلوق بعلمه: في سابقته وقوله: "بعلمه" في محل نصب على الحال، أي خلقهم عالمًا بهم - فمن أثبت العلم، فقد نفى الجهل، ومن نفى الجهل لم يثبت العلم.

غرض یہ کہ اللہ کے لئے صفت علم کا اثبات ضروری ہے۔ یہ نہیں کہنا چاہئے کہ "واللہ لایجهل" کیونکہ جہالت کی نفی علم کے لئے مستلزم نہیں، البتہ اثبات علم نفی جہالت کو مستلزم ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے مخلوق کو اپنے علم سے پیدا کیا، کیونکہ جہل کے ہوتے ہوئے ایجاد الاشياء محال ہے۔

وقدّر لهم أقداراً من خير أو شر - "أقداراً" قَدَّرَ کا مفعول بہ ہے، مفعول مطلق نہیں، کیونکہ یہ مصدر نہیں، بلکہ "قَدَّرَ" کی جمع ہے۔

تقدیر کی تعریف: "وهو تعيين كل مخلوق بمرتبه التي توجد من حسن وقبح ونفع وضرر ومايحيط به من مكان وزمان، ومايرتب عليه من ثواب أو عقاب". (شرح الفقه الأكبر)

قال تعالى: ﴿وَوَخَّلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرَهُ تَقْدِيرًا﴾ (الفرقان: ۲)

"وفي صحيح مسلم عن عبد الله بن عمر رضي الله عنهما، عن النبي ﷺ أنه قال: "كتب الله مقادير الخلق قبل أن يخلق السماوات والأرض بخمسين ألف سنة وَكَانَ عَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ" أخرجه مسلم في صحيحه، رقم (۲۶۵۳) كتاب القدر."

حاصل یہ ہے کہ ہر مخلوق کو جن صفات کے ساتھ جس زمان و مکان میں موجود ہونا ہے، وہ سب ازل میں پہلے سے متعین کر دیئے کا نام تقدیر ہے۔ تقدیر کا یہ مسئلہ اسلام کا قطعی عقیدہ ہے، اس کا منکر کافر ہے۔

و ضرب لهم آجالاً:

یعنی خلایق کی ایک مدت اور میعاد اللہ کے علم میں مقرر ہے۔ جب میعاد پوری ہو کر اس کا وقت پہنچ جائیگا، ایک سیکنڈ تقدیم و تاخیر کی گنجائش نہیں ہوگی۔ "آجال"۔ اجل کی

جمع ہے ”میعاد اور وقت مقررہ“ کو کہتے ہیں۔

لَمْ يَخُفْ عَلَيْهِ شَيْءٌ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَهُمْ وَعَلِمَ مَا هُمْ عَامِلُونَ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَهُمْ.

مخلوق کی پیدائش سے پہلے بھی اللہ سے مخلوق کا کوئی فعل پوشیدہ نہیں، ان کے ان اعمال سے باخبر تھا، جو وہ کرنے والے ہیں۔

اس میں روافض اور قدریہ کی تردید ہو رہی ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ: اللہ تعالیٰ کو کسی چیز کی تخلیق و ایجاد سے قبل اس کا علم نہیں، پیدا کرنے اور موجود کرنے کے بعد اس کو جانتا ہے، یہاں فرمایا کہ: اللہ تعالیٰ ”ماکان“ ”مایکون“ سب جانتا ہے، مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بھی اللہ ان کی پوری واقفیت رکھتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اعمال کا بھی خالق ہے لہذا وہ بندوں کی تخلیق سے قبل ان کاموں کو جانتا ہے جن کو بندے کریں گے۔ الغرض قبل از وقوع حوادث، ہر ایک چیز سے فرداً فرداً اور تفصیلاً اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور ازلی، متعلق اور وابستہ ہے، نہ یہ کہ وقوع کے بعد ان سے اللہ تعالیٰ کا علم وابستہ ہوتا ہے، جیسا کہ روافض اور قدریہ کا خیال ہے۔

(نوٹ) قدری فرقہ (منکرین تقدیر) معتزلہ ہی کی ایک شاخ ہے۔ (شرح

مواقف: طبع لکھنؤ ۷۷/۷۷)

وَأَمْرُهُمْ بِطَاعَتِهِ وَنَهَاهُمْ عَنْ مَعْصِيَتِهِ.

اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی فرمانبرداری کا حکم دیا ہے اور لوگوں کو اپنی نافرمانی سے روکا ہے۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے خلق اور قدر کے بعد امر و نہی کا ذکر کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے کہ: اللہ تعالیٰ نے لوگوں کو اپنی عبادت کی خاطر پیدا فرمایا ہے اور ان کو مکلف بنا یا ہے۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ (الذاریات: ۵۶) گویا پچھلی عبارت میں ”خلق“ اور اس عبارت میں ”امر“ کا ذکر ہے۔ خلق اور

امردنوں کا ذکر آیت ﴿الاله الخلق والامر﴾ (الاعراف: ۵۴) میں بھی ہے۔

وكل شيء يجري بتقديره ومشيتته، ومشيتته تنفذ، لامشيئة للعباد إلا ما شاء لهم، فما شاء لهم كان، ومالم يشأ لم يكن.
کائنات کی ہر شئی اس کی تقدیر اور اس کے ارادے کے مطابق جاری ہے اور اسی کی چاہت چلتی ہے، بندوں کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا، مگر جو ان کے لئے اللہ نے چاہا، تو اللہ نے جو ان کے لئے چاہا وہ ہوا اور جو نہیں چاہا وہ نہیں ہوا۔

فما شاء لهم كان: أي وجد ومالم يشأ لهم لم يكن أي لم يوجد. وفي هذا رد على المعتزلة القائلين: إنما يريد الله من أفعال العباد ما كان طاعة والمعاصي والقباح واقعة بإرادة العبد على خلاف إرادة الله تعالى. وقد قال تعالى: ﴿وماتشاء ون إلا أن يشاء الله﴾ (الذہر: ۳۰)
وہم قد شاءوا المعاصي، فكانت بمشيئة الله تعالى بهذا النص.
(شرح عقيدہ الطحاویہ للمیدانی)

ومن أضل سبيلاً واكفر ممن يزعم أن الله شاء الإيمان من الكافر والكافر شاء الكفر فغلبت مشيئة الكافر مشيئة الله، تعالى الله عما يقولون علواً كبيراً.

حاصل یہ ہے کہ افعال عباد (از قسم طاعات و معصیات ہر دونوں) اللہ ہی کے ارادے سے واقع ہوتے ہیں، اس میں معتزلہ کی تردید ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ: افعال قبیحہ، اللہ کے ارادے سے صادر نہیں ہوتے، بلکہ بندوں کے اچھے افعال اللہ کے ارادے سے صادر ہوتے ہیں۔ ہاں! اتنی بات ضرور ہے کہ اللہ کی مشیت و ارادہ، اللہ کی رضا کو مستلزم نہیں۔ کافر کا کفر بھی تقدیر الہی کے مطابق ہے اور اس کی مشیت و ارادہ کے ماتحت ہے، مگر اس کے ساتھ رضا الہی وابستہ نہیں، کما قال تعالى ﴿ولا يرضى لعباده الكفر﴾ (الزمر: ۷) کیونکہ ایجاد کفر و شر اور کسی کے کفر کا ارادہ کرنا، اس کو مستلزم نہیں کہ اس شر اور معصیت کا ارتکاب بھی پسندیدہ ہو۔ اہل سنت کہتے ہیں: نہ خلق قبیح، قبیح ہے اور نہ ارادہ قبیح، قبیح ہے،

بلکہ کسبِ قبیح، قبیح ہے اور قبیح (مثلاً کفر و معصیت) کے ساتھ متصف ہونا قبیح ہے، جو بندہ کا فعل اختیاری ہے مثلاً تلوار چلانے والے ہی کو قاتل کہا جاتا ہے، تلوار بنانے والے اور بنانے کا ارادہ کرنے والے کو نہ کوئی قاتل کہتا ہے اور نہ ظالم، تلوار کا بنانا اور اس کا ارادہ کرنا، تو کمال ہی کمال ہے، لیکن اگر اس کا استعمال بے محل ہے، تو وہ بلاشبہ معیوب اور مذموم ہے۔ (علم الکلام: ۹۶)

یہدی من یشاء ویعصم ویعافی فضلاً ویضل من یشاء ویخذل
ویبتلی عدلاً.

اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جس کو چاہے بھلائی کی ہدایت دیتا ہے، جس کی چاہے حفاظت کرتا ہے اور جس کو چاہے عافیت دیتا ہے، اور وہ عدل و انصاف کی بناء پر جسے چاہے گمراہ کرے اور بے یار و مددگار چھوڑ دے اور مصیبت میں مبتلا کر کے آزمائے۔

اس عبارت میں بھی معتزلہ کی تردید ہے، معتزلہ کا خیال ہے کہ: ”أصلح للعباد“ یعنی بندہ کے حق میں جو نفع اور انساب ہو، اللہ تعالیٰ پر واجب ہے، جبکہ اہل سنت کے ہاں ایسا کرنا اللہ پر واجب نہیں، اگر اللہ بندوں کو ہدایت دے اور ان کی حفاظت کرے تو یہ محض اس کا فضل ہے اور اگر اس کے برعکس ہو تو یہ اس کا عدل ہے۔

معتزلہ کے ہاں ایک فاسد اصول یہ ہے کہ ”أَنَّ أفعال العباد مخلوقة لهم“ اس وجہ سے معتزلہ ہدایت اور اضلال کی تفسیر دوسری طرح کرتے ہیں، ان کے ہاں ہدایت کے معنی، راہِ حق کا بیان کرنا ہے۔ اضلال کے معنی ”وجدان العبد ضالاً“، یا ”تسمیة العبد ضالاً“ کے ہیں، یعنی بندہ کو ضال پانا یا اس بندہ کا ضال نام رکھنا ہے، جبکہ اشاعرہ ہدایت کے معنی خلقِ طاعت اور خلقِ ابتداء، یعنی بندہ کے اندر طاعت پیدا کر دینا، اور بندہ کو راہِ راست پر چلا دینا، بیان کرتے ہیں، اور اضلال کے معنی خلقِ ضلالت اور خلقِ معصیت بیان کرتے ہیں۔

تعریفِ عصمت: ”وہی ملکہ تحمل صاحبہا علی اجتناب

المعاصی مع التمكن منها.“ (الترغیفات)

عافية: ”وهي دفاع الله تعالى عن العبد.“ (مختار الصحاح)

يخذل: ”بضم الذال يترك نصرته وعونه.“

وكلهم يتقلبون في مشيئته بين فضله وعدله.

تمام لوگ اللہ تعالیٰ کی چاہت اور مشیت کے مطابق اس کے فضل و کرم اور عدل و انصاف کے درمیان چلتے پھرتے ہیں اور زندگی گزارتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مرضی کے مطابق، اللہ کے فضل اور عدل کے درمیان تمام لوگوں کی الٹ پھیر ہے، جس کو اللہ نیکی اور ایمان کی دولت نصیب فرمائیں، تو یہ اس کا فضل ہے اور جس کو اللہ گمراہ کر ڈالے تو یہ اس کا عدل ہے۔ کافروں کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ یہ سوال کر سکیں کہ ہم کو ایسا کیوں بنا دیا؟ اور ہم کو کیوں دوزخ میں ڈالا جاتا ہے؟ کیونکہ مالک کو اختیار ہے، جس شخص کو چاہے کافر بنائے، جس کو چاہے مؤمن بنائے۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام کام فضل اور عدل میں منحصر ہیں، دعاء میں ہمیشہ فضل کی طلب ہونی چاہیے، عدل کی نہیں، کیونکہ قیامت کے دن اگر اللہ تعالیٰ عدل محض شروع کر دے، پھر توجنت میں جانا مشکل ہو جائے گا۔

وهو متعالٍ عن الأضداد والأنداد.

وہ ذات ہمسروں اور شرکاء سے بالاتر ہے۔

الضد: المخالف. الند: المثل.

کوئی بھی اللہ کی مخالفت نہیں کر سکتا، اللہ جو چاہے بلا روک ٹوک سے کر گزرتے ہیں، اللہ کی مثل بھی نہیں۔ کما قال تعالیٰ: ﴿وَلَمْ يَكُنْ لَهُ كُفُوًا أَحَدٌ﴾ معتزلہ کا خیال ہے کہ: بندہ اپنے افعال کا خود خالق ہے۔ ”ضد اور ند“ کی نفی کر کے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے معتزلہ کی تردید کی کہ خالق افعال العبد بھی اللہ ہی ہے، ورنہ اللہ اور بندہ کے درمیان خلق میں شرکت لازم آئے گی ایسے ہی جب بندہ اپنے افعال کا خالق ہوگا تو بندہ کچھ کرے گا اور اللہ کا ارادہ کچھ اور ہوگا اس طرح بندہ اللہ

کا مخالف ہو جائے گا۔

لَا رَادَّ لِقَضَائِهِ وَلَا مَعْقَبَ لِحُكْمِهِ وَلَا غَالِبَ لَأَمْرِهِ.
اللہ تعالیٰ کے فیصلے کا کوئی ٹالنے والا نہیں اور اللہ کے حکم کو کوئی مؤخر کرنے والا نہیں اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے امر اور حکم پر کوئی غالب ہونے والا ہے۔

أَيُّ لَا يَرُدُّ قَضَاءَ اللَّهِ رَادًّا وَلَا يُؤَخِّرُ حُكْمَهُ مُؤَخَّرًا وَلَا يَغْلِبُ أَمْرَهُ غَالِبًا. معقب: يقال: عَقِبَ الحاكم على حكم من كان قبله إذا حكم بعد حكمه بخلافه.

الحاصل اللہ کا نیکوئی حکم و فیصلہ اٹل ہے۔ کوئی طاقت اس کو ٹال سکتی ہے، نہ مؤخر کر سکتی ہے اور نہ ہی اللہ کے امر اور حکم پر کوئی غلبہ کر سکتا ہے۔

أَمَّا بِذَلِكَ كَيْلَهُ وَأَيْقُنًا أَنَّ كَلَامًا مِنْ عِنْدِهِ.
ہم ان سب باتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ہمارا یقین ہے کہ سب کچھ اللہ ہی کی طرف سے ہے۔

بِذَلِكَ: أَيُّ الْقَضَاءِ الْمَقْدُورِ. كَيْلَهُ: خَيْرُهُ وَشَرُّهُ، حُلُوهُ وَمُؤَرَّه. الإيقان: الاستقرار، من يقن الماء في الحوض: إذا استقر كلامًا. اس میں توین مضاف الیہ کے عوض ہے أي كل كائن محدث من عند الله. أي: بمشيئته وإرادته.

رسالت

وَإِنَّ مُحَمَّدًا ﷺ عَبْدُهُ الْمُسْتَطْفَى وَنَبِيُّهُ الْمَجْتَبَى وَرَسُولُهُ الْمُرْتَضَى.
بلاشبہ حضرت محمد ﷺ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے اور اس کے چنے ہوئے نبی اور اس کے پسندیدہ رسول ہیں۔

وَإِنَّ مُحَمَّدًا: "إِنَّ" بکسرہ الہمزۃ ہے اور "إِنَّ اللَّهَ وَاحِدًا لَا شَرِيكَ لَهُ" پر عطف ہے اور یہ سب "نقول" کے معمول ہیں۔ "أَيُّ نَقُولُ فِي تَوْحِيدِ اللَّهِ إِنَّ اللَّهَ وَاحِدًا لَا شَرِيكَ لَهُ وَنَقُولُ إِنَّ مُحَمَّدًا..." "الاصطفاء والاجتباء

والارتضاء“ متقارب المعنی ہیں۔ محمدًا: ”هو علم منقول من اسم مفعول المضاعف، فيسمى بذلك لكثرة خصاله الحميدة أولاً لأنه يُحمد في السماء والأرض ولم يسم به أحد قبله.“ (شارح، ميدانی) ”محمد“ میں برابر محمود سے زیادہ ہے۔

عبدہ: قدّمه على الرسالة امتثالاً لقوله ﷺ كما في الحديث الصحيح: ”ولا تُطروني كما أطرت النصارى عيسى بن مريم وإنما أنا عبدہ ورسوله فقولوا عبد الله ورسوله“ (رواه البخاري عن عمر)

ولأنه أحب الأسماء إلى الله تعالى وذكر الله نبيه ﷺ: باسم العبد في أشرف المقامات فقال: ﴿سبحان الذي أسرى بعبده﴾ (الاسراء) إلى غير ذلك من الآيات. نبيه: من النبوة وهي الرفعة، أي إن له عند الله رتبة شريفة ومكانة منيعة أو من النبأ بالهمزة وقد تسهل، وهو الخبر: أي يكون النبي مخبراً عما بعثه الله تعالى به ومُنبئاً بما أطلعه الله تعالى عليه۔ رسول کی تعریف: ”إنسان بعثه الله تعالى إلى الخلق لتبليغ الأحكام۔

(شرح عقائد)

نبی اور رسول میں فرق

رسول وہ ہے جسے نئی شریعت کی تبلیغ کے لئے بھیجا گیا ہو، بخلاف نبی کے، کہ وہ عام ہے جسے نئی شریعت کے ساتھ مبعوث کیا گیا ہو، وہ بھی نبی ہے اور جسے لوگوں کو شریعت سابقہ پر قائم رکھنے کے لئے بھیجا گیا ہو، وہ بھی نبی ہے، لہذا نبی عام ہے اور رسول خاص ہے۔
(بیان الفوائد)

خاتم الأنبياء وإمام الأتقياء وسيد المرسلين وحبيب رب العالمين۔

اور آپ ﷺ آخری نبی سب متقیوں کے پیشوا اور سب رسولوں کے سردار اور اللہ رب العالمین کے محبوب ہیں۔

آپ ﷺ خاتم الانبياء ہیں، آپ ﷺ کے بعد قیامت تک کوئی نیا نبی پیدا نہیں ہوگا اور کوئی بھی نیا نبی نہیں آئے گا، ہاں عیسیٰ علیہ السلام جو کہ سابق انبیاء میں سے ہیں اور پہلے سے نبی بنائے جا چکے ہیں، وہ آسمان سے نزول فرما کر تشریف لائیں گے، لیکن اب کہ مرتبہ جب عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے، تو آپ کی نبوت موقوف ہوگی مسلوب نہیں ہوگی، کیونکہ نبی اور رسول منصب نبوت و رسالت سے کبھی بھی معزول نہیں کیئے جاتے ہیں، ان کی تخلیق بحیثیت نبی ہوتی ہے، نبی وفات کے بعد بھی نبی ہوتا ہے لیکن عیسیٰ علیہ السلام شریعت محمدی کے قانع اور داعی ہوں گے۔ بہر حال اہل اسلام آپ ﷺ خاتم النبیین کے بعد کسی بھی شخص کے لئے نبوت کی کسی بھی قسم (ظلی، بروزی اور غیر تشریفی) کے قائل نہیں۔ ختم نبوت کے عقیدہ پر قرآن کریم کی سو آیات، دو سو احادیث دلالت کرتی ہیں، اجماع امت اس پر مستزاد ہے، احادیث ختم نبوت حد تو اترا کر پہنچی ہوئی ہیں، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو ”ختم نبوت کامل“ مصنفہ حضرت مولانا مفتی محمد شفیع رحمہ اللہ۔

الإمام: الإمام الذي يؤتم به أي: يقتدون به. الأتقياء: جمع تقى وهو من اتصف بالتقوى، قال البيضاوي: التقوى في عرف الشرع اسم لمن يقي نفسه عما يضره في الآخرة، وكل من اتبع الرسول، واقتدى به، فهو من الاتقياء. وسيد المرسلين: أي سيد جميع المرسلين، قال ﷺ: أنا سيد ولد آدم، ولا فخر. (ترمذی: ۳۶۱۸)

یہاں یہ اشکال پیش آسکتا ہے کہ جب آپ ﷺ انبیاء کے سردار ہیں اور انبیاء سے افضل ہیں، حالانکہ حدیث میں رسول کریم ﷺ نے فرمایا: ”لا تفضلوا بین الأنبياء۔“ (بخاری ۳۴۱۴)

ایسے ہی فرمایا: ”لا تفضلونى على موسى.“ (بخاری: ۲۴۱۱) اور فرمایا: ”لا ينبغي لعبد أن يقول أنا خير من يونس بن متى.“ ان احادیث میں بعض انبیاء کو بعض پر فضیلت دینے کی ممانعت وارد ہوئی ہے۔

جواب یہ ہے کہ: قرآن و حدیث کی کسی دلیل سے اگر بعض انبیاء کی بعض پر

فضیلت معلوم ہوگی، تو اس کے مطابق اعتقاد رکھا جائے، رہی حدیث ”لا تفضلوا بین الانبیاء“ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ: دلیل کے بغیر اپنی رائے سے بعض کو بعض پر فضیلت نہ دو، رہا آپ کا یہ ارشاد ”لا ینبغی لعبد...“ تو یہ اس وقت سے متعلق ہے، جب کہ آپ کو یہ علم نہیں دیا گیا تھا کہ آپ تمام انبیاء سے افضل ہیں، بعد میں بذریعہ وحی آپ ﷺ کو یہ بات بتلا دی گئی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے آپ ﷺ نے اس کا اظہار بھی فرمادیا۔ (مظہری)۔ حبیب: فعیل بمعنی مفعول أي محبوب.

وَكُلُّ دَعْوَةٍ نَبَوَةٍ بَعْدَهُ فَعَيَّ وَهَوَىٰ.
آپ ﷺ کے بعد نبوت کا ہر دعویٰ گمراہی اور خواہش پرستی ہے۔

الغی: ضد الرشاد۔ الهوی: عبارة عن شهوة النفس.

اس سے قبل آپ ﷺ کا خاتم النبیین ہونا جب معلوم ہوا تو اب فرمایا کہ: آپ ﷺ کے بعد کوئی بھی کسی بھی قسم کی نبوت کا دعویٰ کرے گا، تو وہ جھوٹا ہوگا اور اس کا یہ دعویٰ خواہش پرستی کی علامت قرار دیا جائے گا، اس کی کوئی دلیل اور کوئی تاویل قبول نہ ہوگی اور نہ ہی اس سے دلیل طلب کی جائے گی جیسے مسلمان کذاب سے حضرت صدیق اکبر ﷺ اور دیگر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کوئی دلیل نہیں مانگی، بلکہ اس سے قتال کیا۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کی روایت ہے، اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”إنه سيكون في أمتي كذابون ثلاثون كلهم يزعم أنه نبي وأنا خاتم النبيين لأنني بعدي.“ (ابوداؤد: ۲/۲۲۴)

یعنی میری امت میں تیس جھوٹے پیدا ہوں گے، ہر ایک یہی کہے گا کہ میں نبی ہوں، حالانکہ میں خاتم النبیین ہوں۔ (میرے بعد کوئی کسی قسم کا نبی نہیں ہو سکتا)

یہاں اشکال ہو سکتا ہے کہ: آنحضرت ﷺ کے بعد سے آج تک بے شمار لوگ نبوت کا دعویٰ کر چکے، حالانکہ اس حدیث میں صرف تیس کے بارے میں پیشین گوئی کی گئی ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ: اس حدیث میں جن تیس دجالوں کا ذکر ہے وہ وہی ہیں جن کی شوکت قائم ہو جائے، منہج زیادہ ہوں اور ان کا مذہب چلے، ماضی قریب میں اس کا مصداق

مزار غلام احمد قادیانی ہے۔

اشکال: قرآن مجید اور احادیث میں آپ ﷺ کو ”خاتم النبیین“ کہا ہے نہ کہ خاتم الرسول، لہذا ہو سکتا ہے آپ ﷺ کے بعد کوئی رسول آئے۔ جواب: رسول خاص ہے اور نبی عام ہے ”وانتفاء العام يستلزم انتفاء الخاص“ اور جو حضرات ان دونوں (رسول اور نبی) میں تساوی کی نسبت مانتے ہیں، ان کے قول کے مطابق تو کوئی اشکال ہی نہیں۔

وهو المبعوث إلى عامة الجن وكافة الورى المبعوث بالحق والهدى.

آپ ﷺ تمام جن اور تمام مخلوق کی طرف مبعوث ہیں، آپ ﷺ رب کی طرف سے حق کی روشنی کے ساتھ مبعوث ہیں اور اللہ کے حکم سے آپ ہدایت کے نور کے ساتھ بھیجے گئے ہیں۔

آپ ﷺ کی بعثت عام ہے، آپ ﷺ ثقلین (جن وانس) کی طرف مبعوث ہیں، عامۃ الجن کی طرف مبعوث ہونے کی دلیل ایک تو جنات کا یہ قول ہے ﴿يَقُومُوا أَجِيسُوا دَاعِيَ اللَّهِ﴾ (الاتقاف: ۱۳) اے ہماری قوم! اس کی بات مانو جو اللہ کی طرف بلا رہا ہے۔ اس کے علاوہ سورۃ الجن بھی اس پر دلالت کرتی ہے، چنانچہ حضور ﷺ کے وقت بہت بڑی تعداد میں جن مسلمان ہوئے اور حضور سے ملاقات کرنے اور دین سیکھنے کے لئے ان کے وفود حاضر خدمت ہوئے، خفاجیؒ نے روایات کی بنیاد پر دعویٰ کیا ہے کہ چھ مرتبہ آپ ﷺ نے جنات سے ملاقات کی ہے۔ (فوائد عثمانیہ ص ۶۷۲)

وكافة الورى: أي الخلق فهو من عطف العام على الخاص، وإنما ابتدأ بالجن اقتداءً بقوله تعالى ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ﴾ وقد تمت في هذه الآية و نحوها لكون الجن سبقوا في الوجود قال تعالى: ﴿وَالْجَانَّ خَلَقْنَاهُ مِنْ قَبْلِ مِنْ نَارِ السَّمُومِ﴾ (الحجر: ۲۷)

بہر حال آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کو عام ہے، عرب کے اُمیہن یا یہود

ونصاری تک محدود نہیں۔ جیسے ارشاد ہے: ﴿قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا﴾ (الاعراف: ۱۵۸) اپنی خصوصیات میں ایک خصوصیت حضور ﷺ نے یہ بیان فرمائی ہے: ﴿وَأُرْسِلَتْ إِلَى الْخَلْقِ كَافَّةً وَخُتِمَ بِي النَّبِيُّونَ﴾ (الاعراف: ۱۵۸)

قرآن مجید

وَأَنَّ الْقُرْآنَ كَلَامُ اللَّهِ، مِنْهُ بَدَأَ بِلَا كَيْفِيَّةٍ قَوْلًا، وَأَنْزَلَهُ عَلَى نَبِيِّهِ وَحْيًا، وَصَدَّقَهُ الْمُؤْمِنُونَ عَلَى ذَلِكَ حَقًّا، وَآيَقَنُوا أَنَّهُ كَلَامُ اللَّهِ تَعَالَى بِالْحَقِيقَةِ لَيْسَ بِمَخْلُوقٍ كَكَلَامِ الْبَرِيَّةِ.

بے شک قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اس کی ذات سے باعتبار قول بغیر کسی کیفیت کے یہ کلام ظاہر ہوا، اور اس کو اپنے رسول کریم ﷺ پر وحی کی صورت میں اتارا، اہل ایمان نے حق سمجھتے ہوئے اس کی تصدیق کی اور انہوں نے اس بات کا یقین کیا کہ حقیقت یہ اللہ کا کلام ہے، مخلوق کے کلام کی طرح مخلوق نہیں۔

وَأَنَّ الْقُرْآنَ: یہ عبارت "إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى وَاحِدٌ" پر عطف ہو کر "نقول" کا مقولہ ہے۔ آی ونقول إِنَّ الْقُرْآنَ ... مِنْهُ بَدَأَ: آی لا من بعض المخلوقات. اس کی ذات سے کلام ظاہر ہوا، آی هو المتكلم به. اس سے مقصود معتزلہ وغیرہ کی تردید ہے جن کا خیال یہ ہے کہ کلام اللہ، اللہ کی ذات سے ظاہر نہیں ہوا، بلکہ یہ اللہ کی مخلوق اور اللہ کی ذات سے الگ ہے، ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے کلام کی تخلیق ایک محل میں کی، اس کے بعد اسی محل سے کلام کا ظہور ہوا، ان سے یہ بھی منقول ہے کہ: قرآن بطریق تخیل حضرت جبریل علیہ السلام کے قلب پر وارد ہوا، پھر انہوں نے اس کو اپنی زبان سے تعبیر کیا۔ قولا: کہہ کر: اس سے معتزلہ کے خیال کی تردید کر دی گئی۔ بلا کیفیۃ: جار مجرور "قولا" سے حال واقع ہے۔ آی مقولا بلا کیفیۃ، یعنی حرف، آواز اور ظہور کی کیفیت کے بغیر یہ کلام (قرآن مجید) اللہ کی ذات سے باعتبار قول ظاہر ہوا۔

وَحْيًا: آی بواسطۃ الوحي. على ذلك: الاشارة إلى ما ذكره من التكلم به على الوجه المذكور وإنزاله - أنه: آی القرآن والمراد به المقروء. تمام اہل سنت (مذہب اربعہ وغیرہ سلف وخلف) اس پر متفق ہیں کہ قرآن کریم

اللہ کا کلام اور غیر مخلوق ہے۔

فمن سمعه فزعم أنه كلام البشر فقد كفر، وقد ذمّه الله، وعابه،
وأوعده بسقر حيث قال تعالى: ﴿سأصليه سقر﴾ (المدر: ۲۶)
فلما أوعده الله بسقر لمن قال: ﴿إن هذا إلاقول البشر﴾ (المدر: ۲۵)
علّمنا وأيقنّا أنه قول خالق البشر ولا يشبه قول البشر.
جس نے اس کو سن کر یہ گمان کیا کہ یہ انسان کا کلام ہے، تو اس نے کفر کیا، بیشک
اللہ تعالیٰ نے ایسے انسان کی مذمت بیان فرمائی اور اس کا عیب بیان کیا اور اسے جہنم کی
دھمکی دی ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”میں عنقریب جہنم میں داخل کروں
گا“ تو جب اللہ تعالیٰ نے اس شخص کو جہنم کی وعید سنائی ہے جس نے یہ کہا: ”یہ قرآن تو
ایک انسان کا کلام ہے“ تو ہم نے اس حقیقت کو جان لیا اور یقین کر لیا کہ یہ کائنات کے
پیدا کرنے والے ”رب العالمین“ کا کلام ہے اور یہ انسان کے کلام جیسا نہیں۔

جس نے قرآن کے کلام اللہ ہونے سے انکار کیا، بلاشبہ وہ کافر ہے، کیونکہ قرآن
اللہ کا کلام اور اس کی صفتِ قدیم ہے اور جس نے اللہ کی صفتِ قدیم کی نسبت مخلوق کی
طرف کر دی تو وہ مفتری اور کافر ہے۔

ولا يشبه قول البشر: یعنی قرآن، کلام اللہ، جو اللہ کی صفت ہے، یہ بشر کے
قول سے کوئی مشابہت نہیں رکھتا، کیونکہ قرآن اشرف، الفصح اور اصدق ہے، قرآن جیسا کلام
پیش کرنا انسانی طاقت اور بساط سے باہر ہے۔

صفات باری تعالیٰ

ومن وصف الله بمعنى من معانى البشر، فقد كفر، فمن أبصر هذا
اعتبر، وعن مثل قول الكفار انزجر، وعلم أن الله بصفاته ليس كالإنسان.
جو اللہ تعالیٰ کے لئے انسانی صفات میں سے کوئی صفت ثابت کرے، تو بلاشبہ اس
نے کفر کیا، البتہ جس نے اس کو بصیرت کی نگاہ سے دیکھا اسے نصیحت حاصل ہوئی اور کفار
کے قول کی مشابہت سے رک گیا اور اسے اس بات کا علم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ اپنی صفات
میں بشر کی طرح نہیں۔

یہ ”نفسی التشبیہ عقیب الاثبات“ ہے، یعنی پہلے ذکر ہوا کہ قرآن در حقیقت کلام اللہ ہے، اللہ کی ذات سے ظاہر ہوا، تکلم کے ساتھ موصوف ہونے کی وجہ سے اللہ متکلم ہے، انسان کی طرح اللہ متکلم نہیں ہے، کیونکہ صفات الہیہ بشری صفات کے مانند نہیں ہیں۔

قولہ: فمن أبصر هذا اعتبر: جس نے بصیرت کے ساتھ اس سلسلے (اثبات الوصف ونفی التشبیہ) میں غور کر لیا وہ متنبہ ہو جائے گا اور کفار کی طرح بات کرنے سے رک جائے گا۔

رؤیت باری تعالیٰ

والرؤية حق لأهل الجنة بغير إحاطة ولا كيفية، كما نطق به ربنا ﴿وجوه يومئذ ناضرة إلى ربها ناظرة﴾ (القيامة: ۲۲، ۲۳) وتفسيره على ما أراد الله تعالى وعلمه، وكل ما جاء في ذلك من الحديث الصحيح عن رسول الله ﷺ، وعن أصحابه رضوان الله عليهم أجمعين فهو كما قال، ومعناه على ما أراد، لاندخل في ذلك متاولين بأراءنا ولا متوهمين بأهوائنا، فإنه ما سلم في دينه إلا من سلم لله عز وجل ولرسوله ﷺ ورد علم ما أشتبه عليه إلى عالمه.

اہل جنت کی رؤیت (دیدار الہی) باری تعالیٰ برحق ہے، بغیر کسی احاطے اور کیفیت کے، جیسا کہ ہمارے پروردگار کی کتاب نے بیان کیا (بہت سے چہرے اس دن نکھرے ہوئے اپنے رب کو دیکھ رہے ہوں گے) اس کی تفسیر وہی ہے جو اللہ تعالیٰ کی مراد اور اس کے علم میں ہے اور اس سلسلے میں جو احادیث صحیحہ آپ ﷺ اور آپ کے صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین سے منقول ہیں تو وہ بھی اسی مطلب و مفہوم میں ہوں گے جو آپ کی مراد ہے، ہم اس میں تاویل کر کے اپنی آراء اور توہم سے اپنے خیالات داخل کرنا نہیں چاہتے، اس لئے کہ دین میں وہی سلامت رہا جس نے اللہ تعالیٰ اور رسول ﷺ کے لئے تسلیم و اختیار اختیار کیا اور مشتبہ علوم کا علم اس کے جاننے والے کے سپرد کر دیا۔

لأهل الجنة: تخصيص أهل الجنة بالذکر يفهم منه نفی الرؤية عن غیرہم۔
بغیر إحاطة ولا كيفية: یعنی آخرت میں اہل ایمان، اللہ کو دیکھیں گے، مگر

اس کا احاطہ پھر بھی نہیں کر سکیں گے، یعنی مرئی (اللہ تعالیٰ) کے تمام حدود و اطراف کا احاطہ نہیں کر سکیں گے، اس طرح یہ روایت بغیر جہت اور کیفیت کی ہوگی۔

جہمہ، معتزلہ، خوارج اور امامیہ، روایت باری تعالیٰ کے منکر اور مخالف ہیں، جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین، تبع تابعین اور دین کے تمام بڑے مقتدا (اہل سنت والجماعت) روایت باری تعالیٰ کو برحق سمجھتے ہیں، قرآن کریم اور احادیث متواترہ سے یقینی طور پر معلوم ہو چکا ہے کہ آخرت میں دیدار الہی کا شرف حاصل ہوگا۔ (دنیا میں کوئی اللہ کو نہیں دیکھ سکتا، کیونکہ دنیا کی انسانی آنکھوں میں وہ طاقت نہیں جو اللہ کا دیدار کر سکے، لیکن یہاں یہ بات واضح رہے کہ دنیا میں روایت الہی محال عادی و شرعی ہے۔ محال عقلی نہیں، کیونکہ محال عقلی کا وجود کسی جگہ نہیں ہوتا، حالانکہ حق تعالیٰ کا دیدار آخرت میں ہوگا۔ اور دنیا میں بھی وجہ استحالہ روایت، اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں، بلکہ ہماری طرف سے ہے ہم اس کے تحمل نہیں ورنہ حق تعالیٰ میں خفاء نہیں وہ تو یہاں بھی ظاہر ہے اگر آفتاب چمک رہا ہے اور کوئی شخص آنکھ پر ہاتھ رکھ کر دیکھے تو مانع اس شخص کی طرف سے ہوگا آفتاب کو مخفی نہ کہا جائے گا۔

نوٹ: فرشتوں سے بھی اللہ تعالیٰ کا کلام بالمشافہ نہیں ہوتا، جیسا کہ ترمذی کی روایت میں جبریل علیہ السلام سے منقول ہے کہ میں بہت قریب ہو گیا تھا اور پھر بھی ستر ہزار حجاب رہ گئے تھے۔ (معارف القرآن: ۷/۷۱۶)

شب معراج میں اللہ کے رسول نے اللہ کو دیکھا ہے یا نہیں، اس میں چونکہ صحابہ و تابعین کا اختلاف ہے۔ اس لئے علماء میں بھی اختلاف ہے جو علماء روایت کے قائل ہیں، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قاعدہ سے کہ دنیا میں روایت محال عادی ہے، مستثنیٰ کیا ہے، کیونکہ دلیل سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا دیکھنا ثابت ہوتا ہے، وہ کہتے ہیں کہ: دنیا میں استحالہ روایت کی علت رائی کی عدم قابلیت تھی ورنہ مرئی میں تو کوئی مانع ہی نہیں۔ دیگر علماء عدم روایت کے قائل ہیں اور عدم روایت راجح ہے (دنیا میں انسان کی قوت بینائی کا ضعف ہی انسان کے لئے زیارت حق کے درمیان حجاب ہوتا ہے، اس لئے جنت میں جبکہ اس کی بینائی قوی کر دی جائیگی تو وہاں ہر جنّت حق تعالیٰ کی زیارت سے مشرف ہوگا۔ اس سلسلے میں امام طحاوی رحمۃ

اللہ علیہ نے قرآن کریم کی آیت کریمہ ﴿وَجُودَ يَوْمَئِذٍ نَاضِرَةٌ إِلَىٰ رَبِّهَا نَاضِرَةٌ﴾ (العقیدہ: ۲۲، ۲۳) بطور دلیل پیش کی ہے، یعنی مؤمنین کے چہرے اس روز تروتازہ اور ہشاش بشاش ہوں گے اور ان کی آنکھیں محبوب حقیقی کے دیدار مبارک سے روشن ہوں گی۔

لفظ ”نظر“ جب ”إلى“ کے ساتھ متعدی ہو تو، اس کے معنی ہیں ”المعاينة بالأبصار“ آیت میں حرف ”إلى“ صلہ ہے ”ناظرة“ کا، اس لئے رویت کے معنی میں ہوگا۔ نیز ”نظر“ کی نسبت چونکہ وجہ (محل بصر) کی طرف کی گئی ہے اس لئے بھی اس سے ”نظر العين“ مراد ہے۔

رویت باری تعالیٰ کی دوسری دلیل: قرآن کی آیت: ﴿لَهُمْ مَا يَشَاءُونَ فِيهَا وَلَدَيْنَا مَزِيدٌ﴾ (ق: ۳۰) ہے، یعنی جو چاہیں گے وہ ملے گا اور ہمارے پاس ہے کچھ زیادہ بھی۔ قال الطبري: قال علي بن أبي طالب وأنس بن مالك رضي الله عنهما: ”هو النظر إلى وجه الله عز وجل“ ایک اور جگہ ارشاد ہے۔ ﴿لَلَّذِينَ أَحْسَنُوا الْحُسْنَىٰ وَزِيَادَةٌ﴾ (يونس: ۲۶)

بھلے کام کرنے والوں کو وہاں بھلی جگہ ملے گی (یعنی جنت) اور اس سے زیادہ بھی کچھ ملے گا، ”زیادة“ کی تفسیر ”دیدار مبارک“ سے کئی احادیث صحیحہ میں وارد ہوئی ہے اور بہت سے صحابہ و تابعین ؓ سے منقول ہے۔ (فوائد عثمانیہ: ۹۷۲)

اور سنت میں دلیل وہ حدیث مشہور ہے، جس کو اکیس اکابر صحابہ نے روایت کیا ہے، الفاظ حدیث یہ ہیں۔ ”إِنَّكُمْ سَتَرُونَ رَبَّكُمْ كَمَا تَرُونَ الْقَمَرَ لَيْلَةَ الْبَدْرِ“: (تم اپنے پروردگار کو اس طرح دیکھو گے، جس طرح چودہویں شب میں چاند کو دیکھتے ہو) یہاں ”تشبيه الرؤية بالرؤية“ مراد ہے۔ ”تشبيه المرئي بالمرئي“ مراد نہیں تا آنکہ اللہ کے لئے تشبیہ ثابت نہ ہو۔

قرآن وحدیث کے علاوہ رویت پر اجماع امت بھی ہے۔

تفسیرہ علی ما أَرَادَ ... دراصل معتزلہ نے رویت کے بارے میں وارد ہونے والے نصوص قرآن واحادیث میں تحریف سے کام لیا ہے۔ مثلاً امام طحاوی رحمۃ اللہ

علیہ کی پیش کردہ آیت کے بارے میں مخالفین کا کہنا ہے کہ: ”الٰہی“ حرف نہیں ہے، بلکہ اسم ہے اور ”آلاء“ کا مفرد ہے، جس کے معنی نعمت کے ہیں اور ”ناظرۃ“ بمعنی ”منتظرۃ“ کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جنت میں اپنے پروردگار کی نعمتوں کا انتظار کریں گے، حالانکہ یہ تاویل قیاس سے بعید اور سیاق کے مخالف ہے، کیونکہ انتظار کو تو ”أشد من الموت“ کہا گیا ہے، جبکہ آیت کا مقصود یہاں اہل ایمان کے لئے خوشی کا بیان ہے۔ امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اس آیت کریمہ کی وہ تفسیر درست ہوگی، جو اللہ کی مراد اور علم کے مطابق ہو، صرف یہ نہیں بلکہ ”وکل ما جاء ذلك من الحديث الصحيح عن رسول الله ﷺ“ حدیث صحیح جو بھی اس سلسلے میں وارد ہو۔ وعن اصحابه: أي كذلك ماورد عن اصحابه. فهو حق ثابت. كما قال: أي كما قال قائله ولكن علي المعنى الذي أرادہ الله. ومعناه: أي وتفسيره. علي ما أراد: أي مراد الله تعالى. ولا متوهمين: أي ظانين. بأهوائنا: جمع هوى أي هوى النفس. إلا من سلم لله تعالى ولرسوله ﷺ: جميع ماصح عنهما من محكم ومتشابه فأخذ بالمحكم على أحكامه. ورد: أي أسند. علم ما اشتبه عليه: علمه. إلى عالمه: أي على مراده. قرآن کریم کے بارے میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے: ”فما عرفتم منه فاعملوا به، وما جهلتم منه فردوه إلى عالمه“ (بخاری، فی افعال العباد) صاحب شرح المقاصد لکھتے ہیں: ”ذهب أهل السنة إلى أن الله تعالى يجوز أن يرى وأن المؤمنين في الجنة يرونه منزها عن المقابلة والجهة والمكان.“ (شرح المقاصد: ۱۳۴/۳)

ولا يثبت قدم الإسلام إلا على ظهر التسليم والاستسلام.

اسلام کا قدم تسلیم پر رکھنے پر ہی جم سکتا ہے۔

ولا يثبت قدم الإسلام: هذا من باب الاستعارة، إذ القدم الحسني لا تثبت إلا على ظهر شيء. التسليم: بذل الرضاء بالحكم الاستسلام: أي الانقياد ومنه التسليم فيما خفي المراد منه. یعنی جو قرآن وحدیث کے نصوص کے سامنے سر خم تسلیم نہیں ہوتا، تو اس کا اسلام مضبوط نہیں رہتا، اسلام کے برقرار رہنے کے لئے

نصوص قرآن اور نصوص احادیث کے سامنے تسلیم و انقیاد ضروری ہے۔

روى البخاري عن الإمام محمد بن شهاب الزهري رحمه الله أنه قال: "من الله الرسالة وعلى الرسول البلاغ وعلينا التسليم"

فَمَنْ رَامَ عِلْمَ مَا حُظِرَ عَنْ عِلْمِهِ، وَلَمْ يَقْنَعْ بِالتَّسْلِيمِ فَهُمُّهُ حَاجِبُهُ
مَرَامُهُ عَنْ خَالصِ التَّوْحِيدِ وَصَافِي الْمَعْرِفَةِ وَصَحِيحِ الْإِيمَانِ فَيَتَذَبَذَبُ
بَيْنَ الْكُفْرِ وَالْإِيمَانِ وَالتَّصْدِيقِ وَالتَّكْذِيبِ وَالْإِقْرَارِ وَالْإِنْكَارِ مُوسَّسًا
تَائِفًا، زَائِفًا شَاكًّا لَا مُؤْمِنًا مُصَدِّقًا وَلَا جَاهِدًا مُكْذِبًا.

لہذا جو شخص اس چیز کے جاننے کے درپے ہو جس سے اسے روکا گیا ہے اور اس کی
سمجھ، قناعت نہ کرے، تسلیم و رضا پر تو اسے اس کا قصد خالص، توحید، دین کی سمجھ اور صحیح
ایمان سے روک دے گا، پس وہ کفر و ایمان، تصدیق و تکذیب اور اقرار و انکار کے
درمیان شک میں ہے، اس کی حالت ہمیشہ شک کرنے والے اور وسوسوں میں مبتلا رہنے
والے انسان کی سی ہو جاتی ہے جو ایمان کا نہ اقرار کر رہا ہوتا ہے نہ انکار۔

پچھلے جملوں میں جو مضمون ذکر ہوا، یہ اس کی مزید تاکید ہے، حاصل یہ کہ علم کے
بغیر امور دین میں گفتگو کرنا منع ہے۔

فَمَنْ رَامَ : أي طلب. عِلْمَ مَا حُظِرَ عَنْ عِلْمِهِ : أي مُنِعَ عِلْمُهُ.
حَاجِبُهُ : أي منعه. مَرَامُهُ : أي مطلبه. عَنْ خَالصِ التَّوْحِيدِ ... من إضافة
الصفة إلى الموصوف، في المواضع الثلاث إي التوحيد الخالص
والمعرفة الصافية والإيمان الصحيح. فَيَتَذَبَذَبُ : أي يتردد.

موسوساً : اسم فاعل کا صیغہ ہے وسوسہ والا ہونا۔ تائفاً : سرگشتہ و حیران (ض)
سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ "لَا مُؤْمِنًا مُصَدِّقًا وَلَا جَاهِدًا مُكْذِبًا" یہ
"زَائِفًا شَاكًّا" کی تفسیر ہے۔

ولا يصح الإيمان بالرؤية لأهل دار السلام لمن اعتبرها منهم
بوهم أو تأولها بفهم، إذ كان تأويل الرؤية وتأويل كل معنى يضاف إلى
الربوبية. لا يصح، فلا يصح الإيمان بالرؤية إلا بترك التأويل ولزوم
التسليم، وعليه دين المرسلين ومن لم يتوق النفي والتشبيه زلّ ولم
يُصبِ التنزيه.

اور اہل جنت کی رویت باری تعالیٰ (اللہ کے دیدار) پر ایمان صحیح نہ ہوگا اس شخص
کا، جس نے رویت کا وہم سے اعتبار کیا یا فہم سے اس کی تاویل کی جبکہ رویت کی تاویل
کرنا ایسے ہی ہر اس صفت کی تاویل جس کی نسبت ربوبیت کی طرف ہو، درست نہیں،
چنانچہ رویت پر ایمان، تاویل کو چھوڑنے اور تسلیم درضا کو لازم پکڑنے کے ساتھ ہی
درست ہوگا اور اسی پر انبیاء علیہم السلام کا دین ہے، جو شخص نفی اور تشبیہ سے نہیں بچا، پھسل
گیا۔ اور تنزیہ (اللہ تعالیٰ کو صفت نقائص سے پاک سمجھنے) تک رسائی حاصل نہ کر سکا۔

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ مکرین رویت (معترکہ) اور ان لوگوں کی تردید کر رہے
ہیں، جو رویت باری تعالیٰ کے مسئلہ میں تاویل سے کام لے رہے ہیں، جو اس میں تاویل
کرے گا، اس کی دو صورتیں ہیں یا تو رویت کو مانے گا، مگر اس رویت کو تشبیہ دے گا، مخلوق کی
رویت کے ساتھ۔ یا رویت کا بالکل انکار کرے گا اور دونوں طریقے باطل ہیں، کیونکہ اول
میں تشبیہ ہے اور ثانی میں تعطیل ہے۔

لأهل دار السلام: أي لأهل الجنة. بوهم: توهمه. جس میں اس نے
اپنے وہم کا اعتبار کیا ہو، مثلاً یہ سوچا کہ اللہ اصلاً دکھائی نہیں دیتے ہیں اور اگر نظر آئے بھی تو
وہ کسی خاص شکل و صورت میں ہوں گے، حالانکہ اس وہم کو دفع کرنا اس پر لازم تھا۔

أو تأولها بفهم: أي أذى أنه فهم لها تأويلاً يخالف ظاهرها. وتأويل كل
معنى: أي بل تأويل كل معنى ترك تأويله فاسد مراد ہے، کیونکہ وہ
تحریف کے درجے میں ہے ورنہ تاویل کی ایک قسم تاویل صحیح بھی ہے جو مفسرین کے ہاں
معتبر ہے۔ وعلیہ: أي علی ذالک المذكور. ومن لم يتوق: یعنی جس نے
اللہ کی صفات کی نفی سے احتراز نہیں کیا، بلکہ اللہ کی صفات کی نفی کی۔ جیسا کہ معطلہ کا مسلک

ہے۔ والتشبيه: أي ومن لم يتوق التشبيه. جو اللہ کی صفات کی تشبیہ سے محفوظ نہ رہا، بلکہ اللہ کی صفات کو مخلوق کی صفات سے تشبیہ دیتا ہے، جیسا کہ مجسمہ کا خیال ہے۔ ذل أي عن ما يتبعه وضل. ولم يصب التنزيه: أي وما فر بزعمه منه وقع فيه. معترکہ کا خیال ہے کہ: ہم رویت کی نفی کر کے اللہ کی تنزیہ کر رہے ہیں، حالانکہ صفت کمال کی نفی سے تنزیہ کیونکر ہو سکتی ہے؟ اس لئے کہ جب اہل ایمان اللہ کو دیکھیں گے، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکیں گے، تو مرنے والے کے باوجود محاط نہ ہونا صفت کمال ہے، رویت کی نفی، صفت کمال نہیں ”إذ المعدوم لا يرى“ نہ دکھائی دینا تو معدوم کی صفت ہے۔

فلان ربنا جلّ وعلا موصوف بصفات الوجدانية، منعوت بنعوت الفردانية، ليس في معناه أحد من البرية. کیونکہ ہمارا پروردگار جلّ وعلا، صفات وجدانیت کے ساتھ متصف ہے اور صفات فردانیت کے ساتھ منعوت ہے، مخلوق میں سے کوئی اس کا ہم وصف نہیں ہے۔

یہ عبارت ماقبل میں اثبات الصفات اور نفی التشبیہ کی تاکید ہے، یعنی اللہ کی رویت تو ہوگی، مگر مخلوق کی طرح نہیں، کیونکہ اللہ کی ذات کی طرح ان کی صفات بھی یکتا ہیں۔ وصف اور نعت مترادف ہیں، وجدانیت اور فردانیت بھی مترادف ہیں، البتہ بعض نے ان دونوں میں فرق کیا ہے، یعنی وجدانیت ذات کے ساتھ خاص ہے، جبکہ فردانیت صفات کے ساتھ خاص ہے، ”فہو تعالیٰ متوحد فی ذاته متفرد بصفاته“

جلّ أي عظم. علا: أي ارتفع عما لا يليق به.

امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے پہلے جملے سے ﴿اللہ أحد﴾ دوسرے جملے سے ﴿اللہ الصمد لم یلد ولم یولد﴾ اور تیسرے جملے سے ﴿ولم یکن لہ کفو أحد﴾ کی طرف اشارہ کیا ہے۔

وَتَعَالَى اللَّهُ عَنِ الْحُدُودِ، وَالْغَايَاتِ، وَالْأَرْكَانِ، وَالْأَعْضَاءِ،
وَالْأَدْوَاتِ، لِاتِّحَايَةِ الْجِهَاتِ السَّتِّ كَسَائِرِ الْمُبْتَدَعَاتِ.
اللہ تعالیٰ حدود و نہایات اور جسمانی ارکان و اعضاء و آلات سے بالاتر ہے اور نہ
ہی عام اشیاء (مخلوقات) کی طرح جہات ستہ اس پر حاوی ہیں۔

الأركان: جمع ركن وهو لغة: الجانب القوي واصطلاحاً ما يقوم به ذلك الشيء. والأدوات: جمع أداة وهي الآلة.

اس عبارت سے ان مشبہ کی تردید کر رہے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے لئے جسم اور اعضاء کے قائل ہیں، حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ کوئی اللہ تعالیٰ کے حدود اور غایات کا احاطہ کر سکے، کیونکہ حدود اور غایات محدثات کے اوصاف ہیں، آگے امام طحاویؒ کے کلام: ”وقد أعجز عن الإحاطة خلقه“ میں اسی بات کی مزید تشریح آرہی ہے۔ کسائر المتبدعات ”أي كسائر المخلوقات.“ یعنی تمام مخلوقات پر جہات ستہ (دائیں، بائیں، اوپر، نیچے، آگے، پیچھے کی اطراف) حاوی ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی ذات جہات ستہ سے قبل بھی، جہات ستہ کے بغیر موجود تھی اور اب بھی اللہ کی ذات اسی طرح موجود ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ خود خالق جہات ہے تو مخلوق، خالق کا کیسے احاطہ کر سکتی ہے؟ اور کیسے اس کو حاوی ہو سکتی ہے؟

فائدہ:- اللہ کی صفات ”ید، وجہ، ساق اور نفس“ قطعی دلائل سے ثابت ہیں، ولکن لا یقال لهذه الصفات: أنها أعضاء، أو جوارح، أو أدوات، أو أركان، فإن كل هذه المعاني منتفية عن الله تعالى فيقال لله تعالى يد ليس كيدنا، ولله وجه ليس كوجهنا. پس یہ صفات مشترک ”بین الله و بین الإنسان.“ ہیں، لیکن اشتراک صرف لفظی ہے اشتراک معنوی نہیں ہے۔

الغرض مذکورہ صفات (ید، ساق، وجہ، اصبع، نفس، نزول وغیرہ) حق تعالیٰ کی صفات ہیں، لیکن ان مشابہات میں ظاہری معنی، جو تشبیہ کو مستلزم ہے، مراد نہیں ہوتا ہے۔ مثلاً جسمانی ہاتھ جیسا ہمارا ہاتھ ہے، یہ بے شک مراد نہیں، کیونکہ یہ ظاہر متعارف ہے اب

سوال یہ ہے کہ ان الفاظ کے معنی کیا ہیں؟ اس سلسلے میں ایک مذہب تو متکلمین اور متاخرین کا ہے، انہوں نے تشابہات کی مناسب تاویلات کیں، اس لئے ان کو ”مؤولہ“ کہتے ہیں، دوسرا مذہب متقدمین اور محدثین کا ہے جو یہ کہتے ہیں کہ: تشابہات کے معنی مراد اور ان کی کیفیت کے بارے میں توقف و سکوت کیا جائے گا، ان حضرات کو ”مفوضہ“ کہتے ہیں۔ جمہور محدثین میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ بھی شامل ہیں، البتہ جمہور اور علامہ کے مذہب میں ایک باریک فرق ہے، چنانچہ جمہور محدثین ان الفاظ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں نہ یہ کہتے ہیں کہ اس کے حقیقی معنی مراد ہیں اور نہ یہ کہتے ہیں کہ مجازی معنی مراد ہے، جبکہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ ان الفاظ کو حقیقی معنی پر محمول کر کے اس کی کیفیت سے توقف کرتے ہیں، علامہ ان الفاظ کی تشریح سے توقف نہیں کرتے، جبکہ جمہور الفاظ متشابہہ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں۔ البتہ یہ فرق (معاذ اللہ) تشبیہ اور تنزیہ کا فرق نہیں، بلکہ تنزیہ کی تعبیر کا فرق ہے، لہذا اس مسئلے میں علامہ ابن تیمیہ رحمہ اللہ کو جمہور اہل سنت سے مختلف قرار دے کر نشانہ ملامت بنانا درست نہیں ہاں اس قسم کے مسائل میں سلامتی کا راستہ جمہور ہی کا ہے جو ان الفاظ کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں۔

(مخلص از درس ترمذی، افادات حضرت مولانا محمد تقی عثمانی مدظلہ العالی: ۲۰۴/۲)

واضح رہے کہ دونوں مذہبوں میں تفویض اولیٰ ہے، لیکن جس شخص سے خطرہ ہو کہ اگر اس کے سامنے تاویل نہ کی گئی تو وہ کسی شک میں یا کسی بد اعتقادی میں واقع ہو جائے گا، اس کے لئے ایسی تاویل جولغہ و استعمالاً بے تکلف ہو، اختیار کرنے کی گنجائش ہے، چنانچہ تشابہات کی مناسب تاویلات، کتب تفسیر و شروح احادیث میں موجود ہیں، لیکن یہ یاد رکھیے کہ تاویل کا منشا صرف اسی قدر ہے کہ جب مجسمہ نے اس قسم کی آیات و احادیث سے اللہ تعالیٰ کی جسمیت کا خیال کیا تو علماء متاخرین نے ان کے الزام و اسکات کے واسطے تاویل کرنا شروع کیا نہ اس غرض سے کہ یہ معانی مؤولہ مراد ہیں، بلکہ اس غرض سے کہ جسمیت کا شبہ دفع ہو جائے۔ اس لئے لامذہب (غیر مقلدین) کا مؤولہ کو منکرین صفات کے زمرے میں شامل کر کے ان کو مورد الزام ٹھہرانا، نہایت غلو ہے۔ أعاذنا اللہ منہ۔

معراج

والمعراج حقٌ وقد أسري بالنبي ﷺ وعُرج بشخصه في اللحظة،
إلى السماء، ثم إلى حيث شاء الله من العُلَى، وأكرمه الله بما شاء،
وأوحى إليه ما أوحى ما كذب الفؤاد ما رأى، فصلَّى الله عليه وسلم في
الأخرة والأولى.

معراج برحق ہے اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کو رات کے وقت سیر کرائی اور بیداری
کی حالت میں آپ ﷺ کی ذات اقدس کو آسمان کی طرف اٹھایا گیا، پھر بلند یوں پر اللہ
تعالیٰ نے جہاں تک چاہا لے گیا اور اپنی چاہت کے مطابق آپ کو عزت بخشی، اب وحی
فرمائی اپنے بندے کو جو وحی فرمائی، دل نے جھوٹ نہ کہا جو دیکھا، دنیا و آخرت میں آپ ﷺ پر
دروود و سلام ہو۔

والمعراج: أي نقول المعراج حق. المعراج: مفعال من العروج،
أي: ألاله التي يعرج فيها، أي يصعد، وهو بمنزلة السلم، لكن لا نعلم كيف
هو؟ وحكمه كحكم غيره من المغيبات، نؤمن به ولا نشتغل بكيفيته.

علماء کی اصطلاح میں مکہ سے ام ہانی کے گھر سے، بیت المقدس تک کے سفر کو
”إسراء“ اور وہاں سے اوپر ”سدرۃ المنتہی“ تک کی سیاحت کو ”معراج“ کہتے ہیں
اور بسا اوقات دونوں سفرؤں کے مجموعہ کو ایک ہی لفظ ”إسراء“ یا ”معراج“ سے تعبیر
کر دیا جاتا ہے، مسجد حرام سے مسجد اقصیٰ تک کا زمینی سفر جو ”إسراء“ کہلاتا ہے قطعی ہے،
کتاب اللہ کی آیت ﴿سبحان الذي أسرى بعبده ليلاً من المسجد الحرام إلى
المسجد الأقصى﴾ سے ثابت ہے اور پھر مسجد اقصیٰ سے آسمانوں کی طرف عروج جو
معراج کہلاتا ہے، اس کا ذکر سورۃ نجم کی آیات میں اور احادیث متواترہ سے ثابت ہے، اور
آسمانوں سے اوپر عرش تک یا جنت تک یا اس کے علاوہ جن مقامات تک اللہ نے لے جانا
چاہا، اخبار آحاد سے ثابت ہے۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: ”وحدیث الإسراء

أجمع عليه المسلمون وأعرض عنه الزنادقة والملحدون“ (ابن کثیر)

مذہب رائج یہی ہے کہ معراج و اسراء کا واقعہ حالت بیداری میں بجسدہ الشریف واقع ہوا جس کو عروج و عروج آسمانی کہتے ہیں۔ سلف میں سے یہ کسی کا قول نہیں کہ معراج حالت بیداری میں محض روحانی طور پر ہوئی ہو۔ یا منامی طور پر یا کشفی طور پر۔ بڑے صحابہ کرام ؓ کی روایت اس واقعہ معراج میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت (واللہ ما فقد جسد محمد ؐ في ليلة الإسراء) سے مقدم ہے۔ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں فقدان کے معنی طلب کے ہیں۔ (گم ہو جانے والا معنی یہاں مراد نہیں) اب عائشہ رضی اللہ عنہا کے اس ارشاد کا مطلب صاف ہے کہ آپ ؐ اتنی دیر تک گھر سے غائب نہیں رہے کہ آپ ؐ کی طلب اور تلاش کی جاتی، یعنی آپ ؐ گھر سے جدا تو ہوئے، مگر زیادہ دیر نہیں لگی جس سے گھر والوں کو پریشانی ہوئی ہو اور تلاش کی نوبت آئی ہو اس طرح تطبیق ہو جائیگی، باقی طلب اور تلاش کے معنی میں فقدان کا استعمال نص میں بھی آیا ہے۔ ”قالوا وأقبلوا عليهم ماذا تفقدون“.

غرض بشخصہ: سے اشارہ ہے کہ معراج روح کی نہیں تھی۔ فی الیقظة: سے اشارہ ہے کہ معراج عالم خواب میں نہ تھی۔

مکہ مکرمہ سے بیت المقدس تک یہ سفر براق پر ہوا، جب دروازہ بیت المقدس پر پہنچے تو براق کو دروازہ کے قریب باندھ دیا اور آپ مسجد بیت المقدس میں داخل ہوئے اور اس کے قبلہ کی طرف تحیۃ المسجد کی دو رکعتیں ادا فرمائیں اس کے بعد ایک زینہ لایا گیا، اس زینہ کے ذریعے آپ پہلے آسمانوں پر تشریف لے گئے۔ اس کے بعد باقی آسمانوں پر تشریف لے گئے، ہر آسمان میں وہاں کے فرشتوں نے آپ کا استقبال کیا اور ہر آسمان میں ان انبیاء علیہم السلام سے ملاقات ہوئی، جن کا مقام کسی معین آسمان میں ہے، چنانچہ آسمان اول پر آدم ؑ سے اور دوسرے آسمان پر یحییٰ ؑ اور عیسیٰ ؑ سے اور تیسرے پر یوسف ؑ سے اور چوتھے پر ادریس ؑ سے اور پانچویں پر ہارون ؑ سے اور چھٹے پر موسیٰ ؑ سے اور ساتویں پر حضرت ابراہیم ؑ سے ملاقات ہوئی۔

معراج کی احادیث تقریباً تیس صحابہ سے منقول ہیں جن میں معراج و اسراء کے واقعات بسط و تفصیل سے بیان ہوئے ہیں۔

وَأَوْحَى إِلَيْهِ مَا أَوْحَى: یعنی جبریل جب حضور ﷺ کے نزدیک ہو گئے، اس وقت اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص بندہ محمد ﷺ پر وحی بھیجی، غالباً اس سے مراد سورۃ مدثر کی ابتدائی آیات ہیں اور کچھ احکام ہوں گے۔ (نوائد عثمانیہ)

مَا كَذَبَ الْفُؤَادُ مَا رَأَى: یعنی جبریل کو آپ نے آنکھ سے دیکھا اور اندر سے دل نے کہا کہ اس وقت آنکھ ٹھیک ٹھیک جبریل کو دیکھ رہی ہے، کوئی غلطی نہیں کر رہی کہ کچھ کا کچھ نظر آتا ہو۔ (نوائد عثمانیہ)

نوٹ:۔ آسمان سے نبی اکرم ﷺ کا آگے جانا کہاں تک ہے؟ اس میں اختلاف ہے اس وجہ سے امام طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا تعین نہیں فرمایا۔

حوض کوثر

والحوض: الذي أكرمه الله تعالى به غِيَاثًا لَأُمَّتِهِ حَق. حوض کوثر، جس کے ذریعے اللہ نے آپ کو عزت بخشی، آپ کی امت کی سیرابی کے لئے برحق ہے۔

میدان محشر میں ایک حوض ہوگا، جس میں جنت کی ”کوثر“ نامی نہر کا پانی دو آسمانی پر نالوں کے ذریعہ ڈالا جائے گا چنانچہ اصل نہر کوثر جنت میں ہے، لیکن اس حوض کو بھی ”کوثر“ کہتے ہیں، حوض کوثر کے عجیب و غریب اوصاف احادیث متواترہ میں بیان ہوئے ہیں، شارح ابن ابی العزّ کے الفاظ میں ان اوصاف کا خلاصہ یہ ہے۔ ”إنّهُ حوض عظیم و مورد کریم، یمد من شراب الجنة، من نہر الکوثر الّذي هو أشد بياضاً من اللبن وأبرد من الثلج، وأحلى من العسل، وأطيب ريحاً من المسك، وهو في غاية الاتساع، عرضه و طولہ سواء، كل زاوية من زواياه مسيرة شهر.“

اس کے علاوہ احادیث میں یہ بھی ہے کہ اس حوض پر جو آب خورے (پانی پینے

کے برتن) رکھے ہوں گے وہ آسمان کے ستاروں سے زیادہ تعداد میں ہوں گے اور ستاروں سے زیادہ چمکدار ہوں گے۔ ”من شرب منه شربة لا يظمأ أبداً“ ایک مرتبہ جو حوض سے پی لے گا، پھر وہ کبھی پیاسا نہ ہوگا، لوگ قبروں سے پیاسے اٹھیں گے، آنحضرت ﷺ اپنی امت کے پیاسوں کو اسی حوض کوثر سے پانی پلائیں گے اس لئے آپ کو ”ساقی کوثر“ کہا جاتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ”أنا فرطكم على الحوض“ میں حوض میں تمہارا پیشرو ہوں گا، یعنی سب سے پہلے میں پہنچوں گا۔ حوض ہر نبی کا ہوگا جو اپنی اپنی امت کو سیراب فرمائیں گے، لیکن سب سے بڑا حوض محمد عربی ﷺ کا ہوگا اور یہاں آنے والوں کی تعداد بھی زیادہ ہوگی۔

(شرح عقيدة سفارينية ونبراس)

شفاعت

وَالشَّفَاعَةُ الَّتِي اَذْخَرَهَا اللّٰهُ لَهُمْ كَمَا رَوٰى فِي الْاَحْبَارِ .
امت کے لئے رسول اللہ ﷺ کی وہ سفارش برحق ہے، جس کو اللہ نے لوگوں کے لئے ذخیرہ بنا کر رکھا ہے جیسا کہ متعدد احادیث میں اس کا ذکر ملتا ہے۔

وَالشَّفَاعَةُ: اَي وَنَقُولُ الشَّفَاعَةَ الْعَظْمٰى لِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ يَوْمَ

الْقِيَامَةِ فِي كَافَّةِ الْخَلْقِ لِإِرَاحَتِهِمْ مِنَ الْمَوْقِفِ حَقًّا .

یوں تو شفاعت کا ثبوت انبیاء اور صلحاء سب کے لئے ہے، لیکن شفاعت عظمیٰ (جس کو شفاعت کبریٰ بھی کہتے ہیں) صرف ہمارے پیغمبر پاک ﷺ کی خصوصیت ہے، کسی اور نبی کو یہ خصوصیت نہیں دی گئی ہے، اس شفاعت عظمیٰ کی تفصیل اس حدیث میں ہے، جس میں فرمایا کہ: میدان محشر میں شدت گرمی سے سب لوگ تنگ آ کر آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ، اور عیسیٰ علیہم السلام کے پاس شفاعت کے لئے یکے بعد دیگرے جائیں گے اور یہ سب معذرت پیش کریں گے اور بالآخر پیغمبر پاک ﷺ کے پاس آکر شفاعت طلب کریں گے، اللہ کے رسول سجدہ میں گر کر اللہ کی خوب تعریف کریں گے اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائیں گے: ”یا محمد ارفع رأسک، سَلِّ تَعْطِهْ، اِشْفَعْ تُشْفَعْ“ یعنی اے محمد! اپنے سر کو سجدہ سے اٹھائیے، مانگو تجھے دیا جائے گا، شفاعت کر تیری شفاعت قبول کی جائے گی، الغرض

خاتم الانبياء ﷺ یہ شفاعت کبریٰ میدان محشر کی سختی میں تخفیف اور حساب و کتاب شروع کروانے کے لئے فرمائیں گے۔

اہل کبار کے حق میں حضرات انبیاء اور صلحاء امت کی شفاعت بمعنی گناہ معاف کیے جانے کی سفارش ہوگی۔ جسے اللہ تعالیٰ منظور بھی فرمائیں گے، اس سلسلے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث ہے: ”شفاعتی لأهل الكبائر من أمتي“ (رواہ الامام احمد) واضح رہے کہ شفاعت میں شرط یہ ہے کہ شفیع عند اللہ مقبول ہو، یعنی انبیاء اور صلحاء میں ہو اور مشغوع نہ شفاعت کا اہل ہو یعنی مؤمن و موحد ہو، کیونکہ کافر مشرک کی شفاعت نہیں ہوگی۔

معزولہ کہتے ہیں کہ: شفاعت گناہ معاف کرانے اور گناہ گار کو عذاب سے رہائی دلانے کے لئے نہیں ہوگی (جیسا کہ اہل سنت کہتے ہیں) بلکہ نیک بندوں کے ثواب میں زیادتی اور اضافہ کرنے کے لئے ہوگی، غرض یہ کہ اہل جنت کے لئے رفع درجات اور مراتب کی بلندی کے لئے نبی کریم ﷺ جو شفاعت فرمائیں گے، اہل سنت کی طرح معزولہ بھی اس کے قائل ہیں، ایسے ہی معزولہ شفاعت عظمیٰ کے بھی قائل ہیں، معلوم ہوا کہ وہ شفاعت کی ایک خاص قسم کے منکر ہیں۔

عہد میثاق

والميثاق: الذي أخذہ اللہ تعالیٰ من آدم علیہ السلام وذریئہ حقّ۔
سیدنا آدم علیہ السلام اور اولاد آدم سے اللہ تعالیٰ نے جو میثاق (اقرار) لیا وہ بھی برحق ہے۔

اس میثاق سے مراد وہ میثاق ہے کہ جس کا ذکر ”سورة الاعراف ۱۷۲“ میں ہے۔
ارشاد ہے: ﴿وَإِذْ أَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِي آدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَأَشْهَدَهُمْ عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۖ أَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۖ قَالُوا بَلَىٰ ۖ شَهِدْنَا۔﴾
جب نکالا تیرے رب نے بنی آدم کی پیٹھوں سے ان کی اولاد کو اور اقرار کرایا ان سے ان کی جانوں پر۔ کیا میں نہیں ہوں تمہارا رب؟ بولے ہاں ہے۔ ہم اقرار کرتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب موضح القرآن میں فرماتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے حضرت آدمؑ کی پشت سے ان کی اولاد اور اُن سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کروایا اپنی خدائی کا، پھر پشت میں داخل کیا، اس سے مدعی یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں، ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے، باپ کی تقلید نہ چاہئے اگر باپ شرک کرے، بیٹے کو چاہئے ایمان لاوے اگر کسی کوشبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں رہا پھر کیا حاصل؟ تو یوں سمجھئے کہ اس کا نشان ہر کسی کے دل میں ہے اور ہر زبان پر مشہور ہو رہا ہے کہ سب کا خالق اللہ ہے سارا جہاں قائل ہے اور جو کوئی منکر ہے یا شرک کرتا ہے سو اپنی عقل ناقص کے دخل سے پھر آپ ہی جھوٹا ہوتا ہے۔

وقد عَلِمَ اللَّهُ تَعَالَىٰ فِيمَا لَمْ يَزَلْ عِدَدٌ مِنْ يَدْخُلُ الْجَنَّةَ وَعِدَدٌ مِنْ يَدْخُلُ النَّارَ جَمْلَةً وَاحِدَةً فَلَا يُزَادُ فِي ذَلِكَ الْعِدَدُ وَلَا يُنْقُصُ مِنْهُ. وَكَذَلِكَ أَعْمَالُهُمْ فِيمَا عَلِمَ أَنَّهُمْ يَفْعَلُونَهُ.

اللہ تعالیٰ کو ازل سے ان سب لوگوں کا مکمل علم ہے جو جنت میں جائیں گے اور جہنم میں جائیں گے، اس تعداد میں کسی قسم کا اضافہ ہوگا اور نہ کسی اسی طرح لوگوں کے وہ اعمال بھی اللہ کے علم میں ہے جو ان کو مستقبل میں سرانجام دینے ہیں۔

عَلِمَ اللَّهُ تَعَالَىٰ: أَيُّ وَنَقُولُ قَدْ عَلِمَ اللَّهُ..... فِيمَا: أَيُّ فِي عِلْمِهِ الْأَزَلِيِّ الْأَدِيِّ. لَمْ يَزَلْ عَلَيْهِ وَكَذَلِكَ أَعْمَالُهُمْ فِيمَا: أَيُّ فِي الْأَدِيِّ عِلْمٍ مِنْهُمْ أَنَّهُمْ يَفْعَلُونَهُ مِنْ خَيْرٍ وَشَرٍّ وَنَفْعٍ أَوْ ضَرٍّ.

غرضیکہ جتنے لوگ جنت میں داخل ہوں گے ان کی تعداد اور جو جہنم میں جائیں گے، سب کی تعداد اللہ تعالیٰ کے علم میں ازل سے ہے،

وَكُلٌّ مُيسَّرٌ لِّمَا خُلِقَ لَهُ وَالْأَعْمَالُ بِالْخَوَاتِيمِ، وَالسَّعِيدُ مَنْ سَعِدَ بِقَضَاءِ اللَّهِ، وَالشَّقِيُّ مَنْ شَقِيَ بِقَضَاءِ اللَّهِ.

ہر شخص کے لئے وہی کام آسان کیا جاتا ہے، جس کے لئے وہ پیدا کیا گیا ہے، اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے، سعادت مند وہ ہے جس کے لئے تقدیر میں سعادت لکھ دی گئی، بد بخت (بد نصیب) وہ ہے جس کی تقدیر میں بد بختی لکھ دی گئی ہو۔

وکل میسر... یہ مضمون حدیث میں اس طرح بیان کیا گیا ہے: ”إعملوا فکل میسر لما خلق له، أما أهل السعادة، فييسرون لعمل أهل السعادة، وأما أهل الشقاوة فييسرون بعمل أهل الشقاوة“۔

تم عمل کرو، ہر شخص جس کام کے لئے پیدا کیا گیا ہے، وہ اس کے لئے آسان کر دیا جاتا ہے، جو اہل سعادت سے ہوتا ہے اسے اہل سعادت والے عمل کی توفیق دے دی جاتی ہے، اور جو اہل شقاوت سے ہوتا ہے، اس کے لئے اہل شقاوت والے عمل آسان کر دیئے جاتے ہیں۔ (تفسیر بخاری سورۃ اللیل)

﴿فَأَمَّا مَنْ أَعْطَىٰ وَاتَّقَىٰ وَصَدَّقَ بِالْحُسْنَىٰ﴾ [الایة] کا بھی یہی مطلب ہے: الحاصل اللہ تعالیٰ کی عادت ہے کہ سعاد جب نیک عمل اختیار کرتے ہیں اور اشتیاء جب بد عمل کی طرف چلتے ہیں تو دونوں کے لئے وہی راستہ آسان کر دیا جاتا ہے جو انہوں نے تقدیر الہی کے موافق اپنے ارادہ و اختیار سے پسند کر لیا ہے۔

والأعمال بالخواتيم: أي والأعمال إنما تعتبر بالخواتيم. اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے، عقائد انفسی میں اس کی تشریح کچھ اس طرح ہے: ”والسعيد قد يشقى والشقى قد يسعد“ یعنی زندگی بھر ایک آدمی اچھے اعمال کرتا ہے، مگر زندگی کے آخری لمحات میں کچھ اس طرح عمل کر گزرتا ہے، جس کی وجہ سے اس کی سعادت، شقاوت میں تبدیل ہو جاتی ہے، اور کبھی اس کے برعکس زندگی بھر اعمال کفر کرتا ہے، مگر بالآخر ایسا بھلائی کا کام کر گزرتا ہے، جس کی وجہ سے نیک بخت ہو جاتا ہے۔ ”والسعيد من سعد بقضاء الله تعالى والشقى من شقى بقضاء الله تعالى:“ سے اشارہ کرنا چاہتے ہیں، کہ خواتیم کی بناء اللہ کے سابقہ قضاء پر ہے، یعنی سعید اور شقی ابھی وجود میں نہیں آیا، مگر اس کی سعادت اور شقاوت کا فیصلہ پہلے کیا جا چکا ہے، جس کے لئے فیصلہ سعادت ہے، وہ اللہ کا فضل ہے اور جس کے لئے فیصلہ شقاوت ہے، وہ اس کا عدل ہے۔ ہوگا تو وہی جو فیصلہ قدرت کا ہو چکا ہے، مگر اس کے باوجود انسان کا اختیار اور اس کی قدرت جس کی بناء پر وہ امور شرعیہ کا مکلف ہے، برقرار ہے۔

وأصل القدر سرُّ الله في خلقه لم يُطلع على ذلك ملكٌ مقربٌ ولا نبيُّ مرسل، والتعمُّق والنظر في ذلك ذريعة الخذلان، وسَلَمُ الحرمان، ودرجة الطغيان فالحذر كلُّ الحذر من ذلك، نظرًا أو فكرًا أو وسوسةً فإنَّ الله تعالى طوى علمَ القدر عن أنامه ونهاهم عن مرآه كما قال تعالى في كتابه: ﴿لَا يَسْئَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْئَلُونَ﴾ [الأنبياء: ۲۳] ”فمن سأل لما فعل؟ فقد ردَّ حكم الكتاب ومن ردَّ حكم الكتاب، كان من الكافرين.

تقدیر کی حقیقت یہ ہے کہ یہ مخلوق میں اللہ تعالیٰ کا ایک راز ہے، جس کی اطلاع نہ تو مقرب فرشتہ کو ہے نہ ہی کسی نبی مرسل کو، تقدیر میں غور و فکر، نامرادی، محرومی اور سرکشی کا ذریعہ ہے۔ مسئلہ تقدیر میں گھسنے سے مکمل اجتناب ضروری ہے، چاہے اس کا تعلق غور و فکر و سو سے اور خیالات سے ہو، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے تقدیر کا علم اپنی مخلوق سے سمیٹ لیا ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”وہ جو کام کرتا ہے اس سے پوچھا نہیں جائے گا اور جو کام یہ لوگ کرتے ہیں، اس کے بارے میں ان سے پوچھ ہوگی، جس نے اعتراضاً یہ سوال اٹھایا کہ اللہ تعالیٰ نے یہ کام کیوں کیا؟ اس نے قرآن مجید کے حکم کو ٹھکرا دیا اور جس نے قرآن مجید کے حکم کو ٹھکرا دیا وہ زمرہ کفار میں شامل ہو گیا۔

قدر: بتحریر الدال وتسكينها. سر الله. أي علمه بما يكون. لم يُطلع على ذلك: السر الذي أسره سبحانه وتعالى. حضرت علیؑ کا بھی ارشاد ہے: ”القدر سر الله فلا يكشفه“. التعميق: هو المبالغة في الشيء. الخذلان: بالضم، ترك العون والنصرة. سلم الحرمان: بكسر الحاء، یعنی صحیح ایمان پر استقامت سے محرومی کا ذریعہ ہے۔ الذریعۃ والوسیلۃ والدرجۃ والسلم متقارب المعنی، وكذلك الخذلان والحرمان والطغيان متقارب المعنی أيضًا، لكن الخذلان في مقابلة النصر، والحرمان في مقابلة الظفر،

والطغيان في مقابلة الاستقامة. فالحذر... أي إذا كان الأمر كذلك، فاحذر
حذرًا كلَّ الحذر. ”فالحذر“ کے اور پر فافصیحہ ہے اور یہ ”احذر“ فعل کا مفعول مطلق ہے
اور ”کل الحذر“ اس کی تاکید ہے آگے نظرًا، وفکرًا، وسوسۂ تمیز ہے۔

نوٹ: امام طحاویؒ نے مسئلہ تقدیر ایک جگہ بیان نہیں کیا، بلکہ متفرق مقامات میں
بیان کیا ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ ہر چیز جو پیش آنے والی ہے، اللہ کے علم میں
پہلے سے ٹھہر چکی ہے ”وخالف في ذلك القدريّة“ قدریہ کا خیال ہے کہ ہر چیز جو
پیش آنے والی ہے وہ اللہ کے علم میں پہلے سے نہیں ٹھہر چکی ہے، بلکہ ان چیزوں کے وقوع
کے بعد اللہ تعالیٰ ان کو جان لیتا ہے۔ الغرض قبل از وقوع حوادث ہر ایک چیز سے فرداً فرداً
اور تفصیلاً اللہ تعالیٰ کا علم محیط اور ازلی متعلق اور وابستہ ہے نہ یہ کہ وقوع کے بعد ان سے اللہ
تعالیٰ کا علم وابستہ ہوتا ہے جیسا کہ قدریہ کا خیال ہے۔ ”وسمیت هذه الفرقة القدريّة
لإنكارهم القدر“۔

ومن ردّ حکم کتاب اللہ... شکل اول سے قیاس اقترازی کی شکل بن گئی
وہ اس طرح کہ فمن سأل: لم فعل؟ فقد رد حکم کتاب اللہ صغریٰ۔ ومن رد
حکم کتاب اللہ کان من الکافرین کبریٰ۔ اب نتیجہ ہوگا ”من سأل: لم فعل؟
کان من الکافرین“۔

فهذا جملة ما يحتاج إليه من هو منور قلبه من أولياء الله تعالى وهي
درجة الرّلاسخين في العلم، لأنّ العلم علمان: علم في الخلق موجود
وعلم في الخلق مفقود، فإنكار العلم الموجود كفر، وإدعاء العلم
المفقود كفر ولا يثبت الإيمان إلا بقبول العلم الموجود، وترك طلب
العلم المفقود.

یہ وہ تمام باتیں ہیں جن کی ضرورت ہر اس شخص کو ہوتی ہے، جن کے دل
منور ہوں اللہ کے اولیاء میں سے، اور یہ مقام و مرتبہ راخنین فی العلم کو نصیب

ہوتا ہے، کیونکہ علم دو طرح کا ہے ایک علم، مخلوق میں موجود ہے اور دوسرا علم، مخلوق میں ناپید ہے، موجود علم کا انکار اور مفقود علم کا دعویٰ کفر ہے، علم موجود کے قبول کرنے اور علم مفقود کے ترک کرنے سے ایمان میں مضبوطی نصیب ہوتی ہے۔

یعنی وہ مذکورہ باتیں جن پر اعتقاد رکھنا ضروری ہے، ایمان کامل کی علامت ہیں، اس لئے وہ اولیاء اللہ جن کے قلوب منور ہوتے ہیں وہ بھی ان کے ماننے کی جانب محتاج ہیں ”علم موجود“ سے مراد ہے، علم الشریعہ (چاہے اصول ہو یا فروع) اور ”علم مفقود“ سے مراد، تقدیر کا علم ہے۔ حاصل یہ ہے کہ موجود علم کا انکار کفر ہے، ”فمن أنکر شیئاً مما جاء به الرسول کان من الکافرین“ اور مفقود علم کا دعویٰ کفر ہے، ”فمن ادعی علم الغیب کان من الکافرین“ جو لوگ غیر اللہ کو عالم الغیب کہتے ہیں، ان مضامین میں ان کو گہرائی کے ساتھ غور کر لینا چاہئے۔

لوح و قلم

وَنُؤْمِنُ بِاللَّوْحِ وَالْقَلَمِ، وَبِجَمِيعِ مَا فِيهِ قَدَرُ قَم۔
ہم لوح و قلم اور ان تمام چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں جو تقدیر میں لکھ دی گئی ہیں۔

”لوح“ سے، لوح محفوظ مراد ہے، جس کی تعریف علامہ عبدالغنی میدانی (شارح کتاب ہذا) کے الفاظ میں یہ ہے، ”وہو جسم عظیم نورانی کتب فیہ القلم بإذن اللہ تعالیٰ ما ہو کائن إلى یوم القیامة“۔ ”قلم“ سے مراد وہ خاص قلم ہے، جس کا ذکر حدیث میں اس طرح آیا ہے کہ: ”أَوَّلُ مَا خَلَقَ اللہُ تَعَالٰی الْقَلَمَ، فَقَالَ لَهُ: اُكْتُبْ، قَالَ: يَا رَبِّ، وَمَا اُكْتُبُ؟ قَالَ: اُكْتُبْ مَقَادِيرَ كُلِّ شَيْءٍ حَتَّى تَقُومَ السَّاعَةُ“۔ اسی قلم کی قسم اللہ نے قرآن کریم میں کھائی ہے۔ ﴿وَإِنَّ الْقَلَمَ

(أَخْرَجَهُ الْبُودَاؤُودُ وَالتِّرْمِذِيُّ فِي السُّنَنِ: بَابُ الْقَدَرِ)

وَمَا يَسْطُرُونَ﴾ [القلم: ۱]

وَبِجَمِيعِ مَا فِيهِ: أَيِ وَنُؤْمِنُ بِجَمِيعِ مَا فِيهِ.

فَلَوْ اجْتَمَعَ الْخَلْقُ كُلُّهُمْ عَلَى شَيْءٍ ، كَتَبَهُ اللَّهُ تَعَالَى أَنَّهُ كَانَتْ ،
لِيَجْعَلُوهُ غَيْرَ كَانَتْ ، لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ ، وَلَوْ اجْتَمَعُوا كُلُّهُمْ عَلَى شَيْءٍ
كَتَبَهُ اللَّهُ تَعَالَى فِيهِ أَنَّهُ غَيْرَ كَانَتْ لِيَجْعَلُوهُ كَانَتْ ، لَمْ يَقْدِرُوا عَلَيْهِ ،
جَفَّتِ الْقَلَمُ بِمَا هُوَ كَانَتْ إِلَى يَوْمِ الْقِيَامَةِ وَمَا أَخْطَأَ الْعَبْدُ لَمْ يَكُنْ
لِيُصِيبَهُ وَمَا أَصَابَهُ لَمْ يَكُنْ لِيُخْطِئَهُ .

پس اگر جمع ہو جائے پوری مخلوق کسی ایسی شے پر جس کو اللہ تعالیٰ نے لکھ دیا ہے کہ یہ
ہوگی تاکہ وہ مخلوق اس کو نہ ہونے والی بنادے تو وہ اس پر قادر نہ ہوں گے اور اگر ساری
مخلوق کسی ایسی چیز پر جمع ہو جائے جس کو اللہ تعالیٰ نے اس میں نہیں لکھا تاکہ وہ مخلوق اس
کو ہونے والی بنادے تو وہ اس پر قادر نہیں ہوں گے ، اور جو چیز بندہ سے چوک گئی ، (یعنی
اس تک نہیں پہنچی) وہ اس کو پہنچ نہیں سکتی تھی اور جو چیز اس کو پہنچی ہے وہ اس سے چوک
نہیں سکتی تھی ۔

اس طرح کا مضمون حدیث میں ہے : ”عن ابن عباس رضي الله عنهما
قال : كنت خلف النبي ﷺ يوماً ، فقال : ”يا غلام ! ألا أعلمك
كلمات : احفظ الله يحفظك . (تم اللہ کو یاد رکھو ، اللہ تم کو یاد رکھیں گے ۔) احفظ
الله تجده تجاهك . (تم اللہ کو یاد رکھو گے تو اس کو ہر حال میں اپنے سامنے پاؤ گے ۔)
إذا سئلت فاسأل الله ، وإذا استعنت فاستعن بالله ، واعلم أن الأمة لو
اجتمعت على أن ينفعوك بشيء ، لم ينفعوك إلا بشيء قد كتبه الله
عليك ، رفعت الأقلام ، وجفت الصحف . (آخر جہ الترنی فی صفۃ القیامۃ)

امام طحاویؒ کے قول کے ”وما أخطأ العبد ...“ کا مضمون ، دوسری روایت میں
ہے ”واعلم أن ما أخطأك لم يكن ليصيبك ، وما أصابك لم يكن
ليخطئك .“ (مسند احمد)

وَعَلَى الْعَبْدِ أَنْ يَعْلَمَ أَنَّ اللَّهَ قَدْ سَبَقَ عِلْمُهُ فِي كُلِّ كَائِنٍ مِنْ خَلْقِهِ فَقَدَّرَ ذَلِكَ تَقْدِيرًا مُحْكَمًا مُبْرَمًا. لَيْسَ فِيهِ نَاقِصٌ، وَلَا مُعَقَّبٌ، وَلَا مُزِيلٌ، وَلَا مُغَيِّرٌ، وَلَا مُحَوَّلٌ، وَلَا نَاقِصٌ، وَلَا زَائِدٌ مِنْ خَلْقِهِ فِي سَمَواتِهِ، وَارْضِهِ. بندہ پر واجب ہے کہ وہ اس حقیقت کو اچھی طرح جان لیں کہ اللہ تعالیٰ کا علم اس کی مخلوق میں سے ہر ہونے والی چیز سے مقدم ہو چکا ہے، اور اسے مضبوط اور نہ ٹٹنے والی تقدیر سے مقدر کیا ہے، اس تقدیر کو آسمان اور زمین کی مخلوقات میں سے نہ کوئی توڑ سکتا ہے اور نہ ہی کوئی ملٹوی کرنے والا ہے اور نہ کوئی زائل کرنے والا ہے اور نہ کوئی ادا کرنے بدلنے والا ہے اور نہ کوئی اضافہ کرنے والا اور نہ کوئی گھٹانے والا ہے۔

حدیث: ”قَدَّرَ اللَّهُ مَقَادِيرَ الْخَلْقِ قَبْلَ أَنْ يَخْلُقَ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضَ بِخَمْسِينَ أَلْفَ سَنَةٍ وَعَرْشُهُ عَلَى الْمَاءِ.“ کی روشنی میں یہ بات طے ہے، کہ جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ نے مقدر کر رکھا ہے، یہاں اب فرماتے ہیں کہ: جو کچھ کائنات میں ہو رہا ہے وہ پہلے سے اللہ تعالیٰ کے علم میں بھی ہے، اللہ تعالیٰ جانتے ہیں کہ اشیاء اپنے مخصوص اوقات میں موجود ہوں گی اور ہوتا بھی ایسا ہی ہے۔ ”فیثبت علمہ القدیم وفي ذلك الرد على من ينكر علمه القديم.“ غالی قسم کے معتزلہ اس بات سے (کہ اللہ ازل میں عالم تھا) انکار کرتے ہیں۔ وقالوا: إِنَّ اللَّهَ تَعَالَى لَا يَعْلَمُ أَعْمَالُ الْعِبَادِ حَتَّى يَفْعَلُوا، تَعَالَى اللَّهُ عَمَّا يَقُولُونَ غُلُوا كَبِيرًا.

نوٹ: تقدیر دو قسم پر ہیں۔ ایک بدلتی ہے اور ایک نہیں بدلتی جو تقدیر بدلتی ہے، اس کو معلق اور جو نہیں بدلتی اس کو مبرم کہتے ہیں، روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو عمر یا رزق وغیرہ کسی کے تقدیر میں لکھ دیئے ہیں، وہ بعض اعمال کی وجہ سے کم یا زیادہ ہو سکتے ہیں، اور دعاء کی وجہ سے بھی تقدیر بدلی جاسکتی ہے، اس طرح کی تقدیر معلق کہلاتی ہے، لیکن اہل علم فرماتے ہیں کہ: معلق اور مبرم محض تقسیم ظاہری ہے (جو بندوں کے اعتبار سے ہے) ورنہ دراصل تقدیر مبرم ہی ہوتی ہے (یعنی اللہ تعالیٰ کے ہاں ہر تقدیر مبرم ہی

ہے) کیونکہ تقدیر کہتے ہیں: اللہ تعالیٰ کی تجویز کو وہ بدل ہی نہیں سکتی اگر کوئی تقدیر معلق ہو دعاء پر اور دعاء سے اس کا وقوع ہو گیا تو اس کے یہ معنی ہیں کہ تقدیر میں بھی تھا کہ دعاء بھی ہوگی اور اس سے بلا جاتی رہے گی یا مثلاً تقدیر میں یہ ہو کہ دوا کرے گا تو اچھا ہوگا، لیکن یہ واقعہ کہ کرے گا یا نہیں یہ تو مبرم ہی ہے، لہذا تقدیر دراصل مبرم ہی ہوتی ہے۔ (ملفوظات اشرفیہ)

نوٹ: بعض دفعہ لوگ سوچتے ہیں کہ جب ہر کام مقدر من اللہ ہے، تو پھر تدابیر اختیار کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایمان و اعمال سے کیا ہوگا؟ یہ سوچنے کا انداز درست نہیں، کیونکہ تقدیر اپنی جگہ اٹل حقیقت ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ تدبیر اور کسب اختیار کرنا جائز ہے، کیونکہ تقدیری نظام مخفی ہے (کسی کو علم نہیں کہ اس کے بارے میں کیا لکھا ہے جب علم نہیں تو اچھے اعمال ہی کرنے چاہئے) اور تشریحی نظام ظاہر ہے جس کا انسان مکلف ہے، مثلاً کفر و شرک اور چوری وغیرہ اختیاری افعال ہیں، ان میں تقدیر کا حوالہ دینا درست نہیں، حضرت عمر فاروق ؓ کے زمانے میں ایک چور نے چوری کر کے تقدیر کا سہارا لیکر کہا کہ: ”اللہ قدر لی هذا“ حضرت عمر فاروق ؓ نے چور کا ہاتھ کاٹ کر اس کو کوڑے بھی لگوائے اور فرمانے لگے: ”القطع للسرقة والجلد للكذب على الله“ (حاشیۃ الإبانۃ. عن اصول الديانۃ) دوسری بات یہ ہے کہ دنیا کے بارے میں کوئی یہ سوچ کر کہ جو کچھ مقدر ہے وہی ملے گا، اسباب حصول زرق ترک نہیں کرتا، پھر آخرت کے بارے میں یہ منفی رویہ کیوں ہے؟

وذلك من عقد الإيمان، وأصول المعرفة والاعتراف
بتوحيد الله تعالى وربو بيته كما قال تعالى في كتابه: ﴿وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ فَقَدَرْتَنَّهُ﴾ (الفرقان: ۲) وقال تعالى: ﴿وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ قَدَرًا مَّقْدُورًا﴾ (الاحزاب: ۳۸)

مذکور حقائق کو ماننا ایمان کی پہنچائی، معرفت کی بنیاد، توحید باری تعالیٰ اور اس کی ربوبیت کا اعتراف ہے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں ارشاد فرمایا: ”اور اس نے ہر چیز پیدا کر کے ٹھیک اندازہ پر رکھی اور اللہ کا حکم مقدر ہو چکا تھا۔“

وذلك: الإشارة إلى ما تقدم من الإيمان بالقدر وسبق علمه

بالكائنات قبل خلقها. عقد الإيمان : من إضافة الصفة إلى الموصوف أي الإيمان المعقود عليه بالإيقان، والاعتراف : بالرفع، عطفًا على المصدر المتأول من أن يعلم۔ أي الواجب العلم والاعتراف۔

فويل لمن صار لله في القدر خصيماً وأخضر للنظر فيه قلباً
سقيماً. لقد التمس بوهمه في فحص الغيب سرّاً كتيماً، وعاد بما قال
فيه أفاً كذاً أنيماً.

تو بربادی و ہلاکت ہے اس شخص کے لئے جو تقدیر کے معاملے میں اللہ تعالیٰ سے
جھگڑا کرنے والا ہو گیا اور جس نے تقدیر میں غور و فکر کے لئے بیمار دل کو حاضر کیا وہ اپنے
وہم و گمان کے مطابق غیب کی جستجو میں پوشیدہ راز ہائے خداوندی کو تلاش کرنے لگا اور
اس طرح تقدیر کے کے بارے میں جو کچھ اس نے کہا جھوٹا اور گنہگار ٹھہرا۔

لقد التمس... : ما قبل کی علت ہے۔ أي: طلب بوهمه في البحث عن
الغيب سرّاً مكتوماً. حاصل یہ کہ ”القدر سرّاً للہ في خلقه“ کا قاعدہ مسلم ہے، لیکن جب
کوئی شخص اس راز ہائے خداوندی کو تلاش کرنے لگا تو گویا وہ ”اطلاع علی الغیب“ کا قصد
وارادہ کرتا ہے، حالانکہ ارشاد ہے کہ ﴿عالم الغیب فلا یظهر علی غیبه أحدًا﴾ (البقرہ: ۲۶)
(۲۶: عَادَ بِمَا قَالَ فِيهِ : أَي فِي الْقَدْرِ. أَفَا كَذَا: كَذَابًا. أَنِيماً: أَيْ مَاتُومًا).

عرش و کرسی

والعرش والكرسي حقٌّ.
عرش الہی اور کرسی برحق ہیں۔

العرش: في اللغة: عبارة عن السَّيرِ الَّذِي لِلْمَلِكِ. جیسے بلیس کے
تحت کے بارے میں فرمایا: ﴿وَلَهَا عَرْشٌ عَظِيمٌ﴾ [نمل]

یہاں اس سے کیا مراد ہے؟ تو جاننا چاہیے کہ ”عرش“ کے متعلق نصوص سے اس
قدر ثابت ہوتا ہے کہ عرش ایک عظیم جسم ہے جو زمین و آسمان سے بہت بڑا ہے، عرش کے
پائے ہیں اور خاص فرشتے ان پایوں کو اٹھانے والے ہیں اور آسمانوں کے اوپر عام عالم کے
لئے ایک قبہ کی طرح ہے اور یہ تمام مخلوقات کی چھت ہے۔ بیضاوی نے اس کی تفسیر اس

طرح کی ہے۔ ”والعرش: ”الجسم المحيط بسائر الأجسام سمي به لارتفاعه أو للتشبيه بسيرير الملك.“ سورة طہ کی آیت ﴿الرحمن على العرش استوى﴾ کے تحت صاحب روح المعانی علامہ آلوسیؒ نے ”عرش“ کے بارے میں نہایت تفصیلی کلام کیا ہے۔ ”من شاء فليرجعه“۔

الكرسي: بضم الكاف. مستند روايات حديث سے معلوم ہوتا ہے کہ کرسی بھی عظیم الشان جسم ہے جو تمام آسمان اور زمین سے بدرجہا بڑا ہے، کرسی اتنی بڑی ہے، جس کی وسعت کے اندر ساتوں آسمان اور زمین سمائے ہوئے ہیں کما قال تعالیٰ: ﴿وسع كرسيه السموات والأرض﴾ (البقرة: ۲۵۵) اور عرش پھر کرسی سے بھی بڑا ہے، کیونکہ کرسی کی حیثیت عرش کی نسبت ایسی ہے، جیسے ایک بڑے میدان میں انگوٹھی کا حلقہ پڑا ہو۔

والصحيح أن الكرسي غير العرش نقل ذلك عن ابن عباس رضي الله عنهما وغيره“

علامہ میدانیؒ نے کرسی کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے: ”وہو جسم نوراني بين يدي العرش ملتصق به“

وهو مُسْتَغْنٍ، عَنِ الْعَرْشِ وَمَا ذُوْنَهُ، مُحِيطٌ بِكُلِّ شَيْءٍ وَفَوْقَهُ،
وقد أعجز عن الإحاطة خلقه.
اللہ تعالیٰ عرش اور اس کے علاوہ دیگر چیزوں سے بے نیاز ہے، اللہ تعالیٰ ہر چیز کو گھیرے ہوئے ہے اور سب پر غلبہ اور برتری رکھتا ہے اور اس نے مخلوق کو اپنے احاطے سے عاجز کر دیا۔

امام ابو حنیفہؒ اپنی کتاب ”الوصیة“ میں فرماتے ہیں: ”نَقَرَبَانِ اللّٰهَ عَلٰی الْعَرْشِ اسْتَوٰی مِنْ غَيْرِ اَنْ يَكُوْنَ لَهُ حَاجَةٌ اِلَيْهِ، وَاسْتَقْرَارُهُ عَلَيْهِ، وَهُوَ الْحَافِظُ لِلْعَرْشِ، وَغَيْرِ الْعَرْشِ، وَنَعَمْ مَا قَالَ الْاِمَامُ مَالِكٌ رَحِمَهُ اللّٰهُ حَيْثُ سَأَلَ عَنْ ذَلِكَ الْاِسْتَوَاءَ فَقَالَ: ”الْاِسْتَوَاءُ مَعْلُومٌ، وَالْكَيفُ مَجْهُولٌ وَالسُّؤَالُ عَنْهُ بَدْعَةٌ وَالْاِيْمَانُ بِهِ وَاجِبٌ.“ (شرح الفقه الأكبر وسير اعلام النبلاء: ۸/۱۰۰) حاصل یہ کہ اللہ تعالیٰ عرش کا خالق ہے اور عرش پر مستوی ہے، (کما

یلیق بشانہ) لیکن یہ خلق اور استواء اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ عرش کا محتاج ہے، بلکہ اس میں اللہ کی حکمت ہے۔ ایک نسخہ میں لفظ آیا ہے ”وبما فوقہ“ ای محیط بما فوق کل شیء وبما تحته وبما والاہ۔ اس صورت میں مطلب واضح ہے، لیکن ایک دوسرے نسخہ میں ہے وفوقہ: ای انه سبحانه محیط بكل شیء وفوق کل شیء ای فوق المخلوقات۔ اب اس صورت میں اللہ کے لئے فوقیت اور علو کا ثبوت ہوگا، مگر یہ مکان اور جہت کو مستزئم نہیں، فوقیت بدون الجہۃ ہے۔ اللہ امکانہ پر محیط ہے، خود مکافی نہیں اگر اس سے کوئی جہت ”فوق“ ثابت کر دیں پھر تو اللہ محاط ہوگا اور وہ جہت مکان محیط۔ ”فتعالی اللہ عن الجنس والجهات۔“ قرآن کریم میں جہاں اللہ کے لئے ”فوق“ کا لفظ استعمال ہوا ہے مفسرین نے اس کے معنی ”بالادتی، غلبہ اور برتری“ سے کیے ہیں اور بعض نے تشابہات سے قرار دیا۔

فائدہ: وليس المراد من إحاطته بخلقه أنه كالملك، وأن المخلوقات داخل ذاته المقدسة وانما المراد: إحاطة عظيمة، ووسعة، وعلم، وقد أعجز عن الإحاطة خلقه: أي لا يحيطون به علماً ولا رؤية ولا غير ذلك من وجوه الإحاطة.

غرض یہ کہ کوئی چیز اللہ کا احاطہ نہیں کر سکتی، ورنہ محاط کا محیط ہونا لازم آئے گا۔
”سبحان من لا یبلغ الواصفون وصفه، ولا یقدر أحد قدره“

ونقول: إن الله اتخذ إبراهيم خلیلاً، وكلم موسى تكليماً إيماناً وتصديقاً وتسليماً.

پورے ایمان، صدق دل اور تسلیم و رضاء سے ہم اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ: اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام کو اپنا خالص دوست بنایا اور موسیٰ علیہ السلام سے باتیں کی۔

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿واتخذ الله إبراهيم خلیلاً﴾ (نساء: ۱۲۵) اللہ تعالیٰ نے بنالیا ابراہیم علیہ السلام کو خالص دوست۔

الخلة: کمال المحبة. خليل کے معنی ہیں کہ جس کے دل میں محبت اس طرح رائج ہو جائے کہ کسی اور کے لئے اس میں جگہ نہ رہے۔ خليل بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے

جیسے علیم بمعنی عالم۔ اور بعض کہتے ہیں: بمعنی مفعول ہے جیسے حبیب بمعنی محبوب اور حضرت ابراہیم علیہ السلام یقیناً اللہ کے محبت بھی تھے اور محبوب بھی۔ (فتح القدیر) ”خُلتَ“ کے اس مرتبہ میں ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ ساتھ سرورِ دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم بھی شریک ہیں، چنانچہ حدیث میں ہے: ”لو كنت متخذاً من أهل الأرض خليلاً، لاتخذت أبا بكر خليلاً“ (بخاری فی خلق أفعال العباد)

یعنی حضور ﷺ خود خلیل اللہ ہیں، ”وفي رواية إن الله اتخذه خليلاً كما اتخذ إبراهيم خليلاً“۔

موسیٰ علیہ السلام کے کلیم اللہ ہونے کے بارے میں فرمایا: ﴿وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا﴾ (نساء: ۱۶۴)

اور موسیٰ علیہ السلام سے اللہ نے صاف طور پر کلام کیا (واضح رہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے مشافہۃ کلام نہیں سنا، بلکہ پس پردہ صرف آواز سنی) یہ موسیٰ علیہ السلام کی وہ خاص صفت ہے جس میں وہ دوسرے انبیاء علیہم السلام سے ممتاز ہیں، لیکن اس مرتبہ ”تکلم“ میں بھی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ساتھ آنحضرت ﷺ بھی شریک ہیں۔ کما ثبت ذلك في حديث الإسراء “بلکہ ابن کثیر نے اس صفت ہم کلامی میں حضرت آدم علیہ السلام کو بھی شریک مانا ہے (ابن کثیر زیر آیت ﴿تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض﴾)۔

جہمیہ نے حقیقة المحبة من الجانبين اور حقیقة التکليم دونوں سے انکار کیا، چنانچہ انہوں نے اس کا انکار کیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہوں یا موسیٰ علیہ السلام کلیم اللہ ہوں۔

فرشتوں، پیغمبروں اور کتابوں پر ایمان

وَنُؤْمِنُ بِالْمَلَائِكَةِ، وَالنَّبِيِّينَ، وَالْكِتَابِ الْمُنَزَّلَةِ عَلَى الْمُرْسَلِينَ،
وَنَشْهَدُ أَنَّهُمْ كَانُوا عَلَى الْحَقِّ الْمُبِينِ۔

ہم فرشتوں، انبیاء علیہم السلام اور رسولوں پر نازل کی گئی تمام کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ تمام انبیاء علیہم السلام کھلے حق پر تھے۔

مندرجہ بالا پانچ امور، ارکان ایمان کہلاتے ہیں، قال ابوطالب المکی رحمۃ اللہ: أركان الإيمان سبعة، یعنی هذه الخمسة والإيمان بالقدر، والإيمان بالجنة والنار. ”بقیہ تین کا ذکر امام طحاویؒ آگے فرمائیں گے۔

ملائکہ کی تعریف

”الملائكة أجسام لطيفة تظهر في صور مختلفة وتقوى على أفعال شاقة؛ هم عباد مكرمون يواظبون على الطاعة والعبادة، ولا يوصفون بالذكورة والأنوثة.“ (شرح المقاصد: ۳۱۹/۳) فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے فرشتوں کا انکار کرنے والا مؤمن نہیں، ایسے ہی تمام انبیاء اور مرسلین پر ایمان لانا ضروری ہے، اللہ تعالیٰ پر ایمان اس شخص کا معتبر ہے جو انبیاء کرام پر ایمان رکھتا ہے۔ جن آسمانی کتابوں اور صحیفوں کا ثبوت دلائل قطعیہ سے ہے، ان پر بھی ایمان لانا ضروری ہے۔

وَنُسَمِّي أَهْلَ قِبَلَتِنَا مُسْلِمِينَ مُؤْمِنِينَ، مادامو! بما جاء به النبي ﷺ معتبرين، وله بكل ما قال وأخبر مصدقين غير مكذابين.

ہم اہل قبلہ کو اس صورت میں مسلمان و مؤمن سمجھتے ہیں، جب تک وہ اس دین پر قائم رہیں، جو رسول اکرم ﷺ لیکر آئے، اور اس دین کا اعتراف کریں، اور جو کچھ آپ نے فرمایا اور جس کی خبر دی اس کی تصدیق کرتے ہیں، نہ کہ تکذیب اور آپ کی تمام باتوں اور احادیث کو سچے دل سے تسلیم کرتے ہیں۔

اہل قبلہ کی تعریف

اولاً یہ سمجھئے کہ ضروریات دین سے مراد یہ ہے کہ وہ مسئلہ ایسا ہو کہ ہر وہ شخص جسے کچھ بھی دین سے تعلق ہو، اس کو من الدین سمجھتا ہو، یعنی وہ اسلام کے اجلی البدیہیات مسائل سے ہو اب اہل قبلہ کی تعریف سمجھئے اہل قبلہ وہ کہلائیں گے جو تمام ضروریات دین (مثلاً حدوث عالم، حشر الاجساد، علم اللہ بالکلیات والجزئیات اور ختم نبوت وغیرہ) پر ایمان رکھتے ہوئے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے ہوں، اہل قبلہ کا قطعاً یہ مطلب نہیں کہ جو بھی شخص صرف قبلہ رخ ہو کر نماز پڑھتا ہو، چاہے وہ کسی قطعی حکم کا منکر بھی کیوں نہ ہو، کیونکہ قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز تو مسیئہ کذاب

بھی پڑھتا تھا۔ الغرض اگر کوئی کسی بھی ایک امر ضروری کا انکار کر دے تو وہ اہل قبلہ نہ ہوگا اسی طرح مؤول کو کافر نہیں کہنا چاہئے، لیکن مؤول اگر تاویل کرتے ہوئے قطیعات (جو ضروریات دین سے ہو) کا انکار کر دے تو ایسا مؤول کافر ہو جائے گا۔ لفظ ”مؤمنین و مسلمین“ لا کر امام طحاویؒ نے ایمان اور اسلام کے مترادف اور اتحاد کی طرف اشارہ کیا۔

ولا نخوض في الله، ولا نماري في دين الله.
ہم ذات خدا میں سوچ و چار نہیں کرتے اور نہ ہی اللہ کے دین میں جھگڑتے ہیں۔

حضرت امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ کی روایت ہے فرمایا: ”لا ينبغي لأحد أن ينطق في ذات الله بشيء، بل يصفه بما وصف به نفسه“ (شرح عقيدة الطحاوية للميداني) ”ولا نماري في دين الله“ علامہ میدانی نے اس کا مطلب لکھا ہے: ”ای“ ”لانداهن في دين الله“ اللہ کے دین میں ہم بے پرواہی اور اہانت سے کام نہیں لیتے ہیں، ابن ابی العزّاس کی شرح میں فرماتے ہیں: ”لانخاصم أهل الحق بإلقاء شبهات أهل الأهواء عليهم، التماساً لامترأء هم وميلهم، لأنه في معنى الدعاء إلى الباطل، وتليبس الحق، وإفساد دين الاسلام“ بہر حال ”الخوض في الله“ اور ”الممارسة في الدين“ دونوں منع ہیں۔

و لا نجادل في القرآن و نشهد أنه كلام رب العالمين نزل به الروح الامين، فعلمه سيد المرسلين محمدًا ﷺ وعلى اله أجمعين وهو كلام الله تعالى، لا يساويه شيء من كلام المخلوقين، ولا نقول بخلقه ولا نخالف جماعة المسلمين .

ہم قرآن کے ظاہری معانی میں جھگڑا نہیں کرتے، بلکہ اس بات کی گواہی دیتے ہیں کہ یہ سارے عالم کے پروردگار کا کلام ہے، جبریل علیہ السلام اسے لیکر نازل ہوئے اور سارے نبیوں کے سردار ﷺ کو یہ کلام سکھلایا، بلاشبہ یہ کلام الہی ہے، مخلوق کا کلام اس کے مساوی نہیں ہو سکتا نہ ہی ہم اللہ کے کلام کو مخلوق کہتے ہیں اور نہ مسلمانوں کی جماعت کی مخالفت کرتے ہیں۔

ولانجادل ... اس جملہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ (۱) لانقول في القرآن كما قال أهل الزيغ واختلفوا وجادلوا بالباطل ليذحضا به الحق، بل نقول إنه كلام رب العالمين إلى آخر كلامه (۲) أنا لانجادل في القراءات الثابتة بل نقروءه بكل ماثبت وصح. الروح الأمين: هو جبريل عليه السلام، سمي روحاً، لأنه حامل الوحي الذي به حياة القلوب وسمي أمين، لأنه أمين حق أمين. فعلمه: یعنی جبریل عليه السلام نے حضور ﷺ کو قرآن کی تعلیم دی، یہ دراصل قرامطہ وغیرہ کی تردید ہے، ان کا خیال یہ ہے کہ اللہ کے رسول نے الہام کے طور پر اپنے دل ہی دل میں قرآن کے مضامین کا تصور کیا۔ وهو كلام الله لا يساويه ...: كلام الله چونکہ رب العالمین کی صفت ہے اور یہ حقیقت ہے کہ ”ان من شبه من صفات الله بشيء من صفات المخلوقين، كان من الكافرين. ولا نقول بخلق القرآن: لأن الخلق صفة المحدث العديم والقرآن كلام الله قديم. جماعة المسلمين: أي يجب علينا أننا لانخالف السواد الأعظم أهل السنة والجماعة في جميع ما اتفقوا عليه، فإن خلافهم زيغ، وضلال، وبدعة وفيه تنبيه على أن من قال بخلق القرآن فقد خالف جماعة المسلمين.

نوٹ: مسلمانوں کی جماعت سے پاکستان کی ”جماعت المسلمین رجسٹرڈ“ جس کی داغ بیل تیس سال قبل ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے ڈالی، مراد نہیں، بلکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعین اور تبع تابعین کی جماعت مراد ہے، جس کی تعبیر اہل سنت والجماعت سے کی جاتی ہے اور یہ دراصل ”ما انا عليه وأصحابي“ سے ماخوذ ہے۔ دراصل لاندھب (غیر مقلدین) سے الگ ہو کر مسعود احمد نے صرف پاکستان کی سطح پر شرذمہ قلیلہ ”جماعت المسلمین پاکستان“ کو رجسٹرڈ کروا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم اور خارج از اسلام قرار دیا اور بجائے فرقہ واریت کے خاتمہ کے ایک نئے فرقہ نے جنم لیا، صرف نام رکھ لینے سے کچھ نہیں بنے گا جس طرح بدعتی حضرات نے اپنے آپ کو سنی کہنا شروع کر دیا ہے، لیکن سنی نام رکھ لینا اور سنت کی خلاف ورزی کرنا آخرت میں ہرگز مفید نہیں ہوگا۔ اسلام اور مسلمین کی صفت سے خفی، شافعی، حنبلی اور مالکی وغیرہ متصف ہیں، موجودہ مسعود احمد کی

پارٹی جعلی جماعت المسلمین ہے۔

ولا تكفر أحدًا من أهل القلبية بذنوب ما لم يستحلّه ولا نقول:
لا يضر مع الإيمان ذنب لمن عمله.
جب تک اہل قبلہ (مسلمان) کسی گناہ کو عقیدے کے اعتبار سے جائز و حلال
نہیں سمجھتے، ہم انہیں کافر قرار نہیں دیتے اور ہم یہ نہ کہیں گے کہ ایمان کے ساتھ کوئی
گناہ مفسر نہیں، اس شخص کے لئے جس نے گناہ کیا۔

خوارج اور مرجع افراط و تفریط کے شکار ہیں، چنانچہ خوارج ہر گناہ کے مرتکب کو
کافر قرار دیتے ہیں، جبکہ مرجع کسی قسم کا گناہ ایمان کے لئے مفسر نہیں سمجھتے ہیں، ان کا کہنا
ہے کہ: ”حسناتنا مقبولة وسيئاتنا مغفورة“ ولا تكفر: سے خوارج اور ولا نقول
:”لا يضر“ سے امام طحاوی نے مرجع کی تردید کی طرف اشارہ کیا۔ اہل السنۃ والجماعۃ عاصی
اور فرمانبردار کے لئے عقاب و ثواب قطعی اور یقینی نہیں سمجھتے، بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر
چھوڑتے ہیں۔

نوٹ: کسی بد عملی اور گناہ سے مسلمان کافر نہیں ہوتا، لیکن ایسی بد عملی جو
امارات کفر و علامات تکذیب ہو، آدمی کو دائرہ اسلام سے خارج کر دیتی ہے۔ مثلاً بت کو
سجدہ کرنا، قرآن کریم کو نجاست میں ڈالنا یا پاؤں سے روندنا کفر ہے۔ (شرح عقائد: ۹۰)

ونرجوا للمحسنين من المؤمنين، أن يعفو عنهم ويُدخلهم الجنة
برحمته ولا نأمنُ عليهم، ولا نشهد لهم بالجنة ونستغفر لمسيئهم
ونخاف عليهم ولا نُقْطِطهم.

ہم مؤمنین میں سے نیک لوگوں کے بارے میں امید رکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو
معاف فرمادے گا اور انہیں اپنی رحمت سے جنت میں داخل فرمائے گا اور ہم ان پر بے
خوف نہیں ہیں، لیکن جنت میں یقینی داخلے کی ہم گواہی نہیں دیتے، ہم گنہگاروں کے لئے
بخشش کی دعاء کرتے ہیں ہمیں ان کے متعلق ڈر ہے، لیکن ہم انہیں مایوس نہیں کرتے۔

نیک لوگ باوجود غایت قرب کے ان کی امیدیں محض حق تعالیٰ کی مہربانی
سے وابستہ رہنی چاہئے اور اسی کے عذاب سے ہمیشہ لرزاں و ترساں رہنا چاہئے، اس

لئے تو کہا گیا ہے کہ ”الإيمان بين الخوف والرجاء“ منافق اور گنہگار شخص برائی کے ارتکاب کے باوجود اللہ کے عذاب سے بے خوف رہتا ہے، حالانکہ اس کو چاہئے کہ اپنے بارے میں ڈرے، مگر اللہ سے مایوس بھی نہ ہو۔ لأننا من عليهم : أي ولكن لأننا من عليهم مكر الله تعالى إذ لا يأمن مكر الله إلا القوم الخاسرون“ یعنی اللہ تعالیٰ کے عذاب کے سلسلے میں ہم ان پر بے خوف نہیں، کیونکہ خسارہ کرنے والے لوگ ہی اللہ کے عذاب سے بے خوف ہوتے ہیں۔ لأنقنطهم : لیکن ہم انہیں مایوس نہیں کرتے۔ إذ لا يأس من روح الله إلا القوم الكافرون۔ قال أبو علي الروذباري رحمه الله: ”الخوف والرجاء كجناحي الطائر إذا استويا، استوى الطير، وتم طيرانه وإذ انقص أحدهما وقع فيه النقص وإذا ذهب، صار الطائر في حد الموت“ اسی کو آگے امام طحاوی فرماتے ہیں۔

وَالْأَمْنُ وَالْإِيَّاسُ يَنْقُلَانِ عَنْ مِلَّةِ الْإِسْلَامِ وَسَبِيلِ الْحَقِّ بَيْنَهُمَا
لَأَهْلِ الْقِبْلَةِ.

بے خوفی اور مایوسی ملت اسلام سے متا دیتی ہے، اہل قبلہ اور مسلمانوں کے لئے سیدھا راستہ ان دونوں کے درمیان ہے۔

الْأَمْنُ : یعنی اللہ کے عذاب سے بے خوفی۔ وَالْإِيَّاسُ : اللہ کی رحمت سے مایوسی۔
وسبیل الحق : أي وسبیل القول الحق ما بینہما وهو القول لأهل القبلة.

ولا يخرج العبد من الإيمان إلا بجُحود ما أدخله فيه.

بندہ مومن ایمان کے دائرہ سے اس وقت تک نہیں نکل سکتا جب تک کے ان باتوں کا انکار نہ کر دے جن کی بناء پر ایمان میں داخل ہوا تھا۔

امام طحاوی نے اس عبارت میں خوراج اور معتزلہ کی تردید کی ہے، جن کا مسلک یہ ہے کہ مرتکب کبیرہ ایمان سے خارج ہو جاتا ہے (خوراج کے ہاں ایمان سے خارج ہو جانے کے بعد کفر میں داخل ہوتا ہے، جبکہ معتزلہ کا خیال یہ ہے کہ ایمان سے تو نکل جاتا ہے، مگر کفر میں بھی داخل نہیں ہوتا، اس حالت کو وہ ”منزلة بين المنزلتين“ سے تعبیر کرتے ہیں)۔

إلابجحدما: أي الذي أدخله فيه: ”أدخل“ کی ضمیر فاعل بسوءے ما موصولہ ہے، ”ہ“ کی ضمیر مفعول ”عبد“ کی طرف راجع ہے، فیہ کی ضمیر مجرور، ایمان کی طرف لوٹ رہی ہے۔ غرضیکہ قطعیات میں سے ضروریات دین کا انکار کئے بغیر بندہ ایمان سے خارج نہیں ہوتا۔

نوٹ: مصنف ”بر بناء تقریر و تاکید ایک ہی عقیدہ کو مختلف الفاظ واسلوب میں بیان فرمادیتے ہیں، تاکہ ”أوقع في الذهن“ ہو جائے۔

وَالْإِيمَانُ هُوَ الْإِقْرَارُ بِاللِّسَانِ وَالتَّصْدِيقُ بِالْجَنَانِ.

ایمان زبان سے کہنے اور دل سے سچا ماننے کا نام ہے۔

”ایمان“ باب افعال سے ہے، جو ”امن“ سے ماخوذ ہے۔

الإيمان في الأصل جعل الغير امناً ثم وضع للتصديق، لأن المصدق كأنه يجعل المخبر امناً من التكذيب والمخالفة.

ایمان کی شرعی تعریف: (۱) متن میں امام طحاویؒ نے امام ابوحنیفہؒ اور ان کے اصحاب سے جو تعریف نقل کی ہے، یہ ایمان کی شرعی تعریف ہے، اس تعریف کی تشریح بالفاظ دیگر یوں ہے: ”الإيمان في الشرع هو تصديق النبي ﷺ بالقلب في جميع ما جاء به من عند الله تعالى والإقرار بجميع ما جاء به النبي ﷺ“ گویا اس تعریف کی رو سے ایمان کا تعلق قلب اور لسان سے ہے، یعنی یہ دونوں ایمان کے رکن ہیں۔

(۲) مگر شیخ ابو منصور ماتریدی کا کہنا یہ ہے کہ: ”إن الإقرار باللسان ركن زائد ليس بأصلي فالإيمان هو التصديق بالقلب وإنما الإقرار شرط لإجراء الأحكام في الدنيا من حرمة الدم، والسمال، وصلوة الجنابة عليه، ودفنه في مقابر المسلمين“ بعض حضرات کا خیال ہے کہ: امام ابوحنیفہؒ ”کا بھی یہی مسلک ہے، اس مذہب کی رو سے ایمان کا تعلق صرف قلب ہی سے ہے، زبان سے اقرار کرنا اجراء احکام اسلام کے لئے شرط ہے، کیونکہ کسی کا مسلمان ہونا زبانی اقرار سے ہی معلوم ہوگا، چنانچہ اگر ایک شخص دل سے تصدیق کرتا ہے اور زبان سے اقرار نہیں کرتا، اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ مسلمان ہے۔

(۳) ”ذهب مالک، والشافعی، وأحمد وغيرهم إلى أن الإيمان تصديق بالجنان، وإقرار باللسان، وعمل بالأركان“ اس مذہب کی رُو سے ایمان کا تعلق قلب، لسان اور جوارح تینوں سے ہے۔
دلائل اور مزید تفصیل شرح عقائد میں ہے اگلے سال مشکوٰۃ شریف اور اس سے اگلے سال بخاری شریف میں بھی پڑھ لیں گے۔

وجميع ما صحَّحَ عَنْ النَّبِيِّ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مِنَ الشَّرْعِ
وَالْبَيَانِ كُلُّهُ حَقٌّ.
جو کچھ شرع اور بیان کی باتیں، جن کی نسبت رسول اللہ ﷺ سے درست ہو، سب کے سب حق ہیں۔

اس عبارت میں تعطیل نصوص کی تردید ہو رہی ہے، کیونکہ اہل سنت نص صحیح سے عدول نہیں کرتے، جبکہ جمہیہ، معطلہ، معتزلہ اور روافض وغیرہ ظاہری نصوص کو بسا اوقات معطل کر کے ظاہر سے عدول کرتے ہیں۔
پیغمبر اسلام ﷺ کے ارشادات دو قسم کے ہیں:
(الف) وہ ہیں کہ جن میں ایسے احکام جدیدہ کو مشروع فرمایا کہ جو قرآن میں مذکور نہیں۔

(ب) وہ ہیں جن میں احکام قرآنی کی وضاحت اور تفسیر ہو، امام طحاویؒ نے اپنے قول: ”من الشرع والبیان“ سے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

والإيمان واحدٌ وأصله في أصله سواءٌ والتفاضل بينهم بالتقوى
ومخالفة الهوى وملازمة الأولى.
ایمان واحد ہے اور اس کے اہل (تمام مؤمنین) اس کی اصل (ایمان) میں برابر ہیں، لیکن ایک دوسرے پر برتری تقویٰ، اپنی خواہشات نفسانی کی مخالفت اور اولیٰ و افضل کو لازم پکڑنے کی وجہ سے ہے۔

الإيمان واحدٌ : لأنَّ الإيمان التصديق البالغ حد الجزم

والإذعان الذي لا يقبل التشكيك، والأعمال غير داخله في حقيقة الإيمان. وأهله: أي أهل الإيمان من الملائكة والأنبياء والأولياء وسائر المؤمنين الأبرار والفقار. في أصله: الذي هو التصديق كلهم فيه. سواء: أي لا تفاضل فيه من حيث ذاته ولا يزيد ولا ينقص. الحاصل أن التفاوت بين المؤمنين بأعمال القلوب. وأما التصديق فلا تفاوت فيه. قال أبو حنيفة وأصحابه رحمهم الله: لا يزيد الإيمان ولا ينقص، واختاره من الأشاعرة إمام الحرمين، وذهب عامتهم إلى زيادته ونقصانه.

غرضيكہ مؤمنین، نفس ایمان میں سب برابر ہیں، ان میں تفاضل اور مراتب ایمانی کا اختلاف، تقویٰ، اخلاص کی زیادتی اور اعمال صالحہ کی کمی و بیشی کی بناء پر ہے۔

والمؤمنون كلهم أولياء الرحمن وأكرمهم عند الله، أطوعهم وأتبعهم للقرآن.

سب اہل ایمان، رحمان کے دوست ہیں ان میں سب سے زیادہ عزت والا قرآن کی سب سے زیادہ اطاعت کرنے والا اور زیادہ پیروی کرنے والا ہے۔

الولي: من الولاية (بفتح الواو) التي هي ضد العداوة. الولي: خلاف العدو، وهو مشتق من الولي. وهو الذنو والتقرب، فولي الله: هو من والي الله بموافقة في محبوباته. والتقرب إليه بمرضاته. قال صاحب شرح العقائد: الولي: هو العارف بالله وصفاته حسب ما يمكن، المواظب على الطاعات، المجتنب عن المعاصي المعرض عن الإثم في اللذات والشهوات.

فالمؤمنون أولياء الله، والله تعالى وليهم وأما أولياء الله الكاملون، فهم الموصوفون في قوله تعالى ﴿أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللَّهِ لَا خَوْفَ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ﴾ [الاية] (يونس ٦٢، ٦٣)

والإيمان: هو الإيمان بالله وملائكته وكتبه ورسله واليوم الآخر، والقدر خيره وشره وحلوه وممره من الله تعالى.

ایمان نام ہے سچے دل سے یقین کرنے کا اللہ تعالیٰ پر اس کے فرشتوں پر اس کی آسمان کتابوں پر اور اس کے رسولوں پر اور آخرت کے دن پر اور یہ کہ اچھی بری، مٹھی کڑوی تقدیر اللہ کی طرف سے ہے۔

الإيمان: أي الإيمان المطلوب من المكلف. هو الإيمان: أي الإقرار مع التصديق والإذعان. بالله: تعالى بأنه موجود بصفاته الواجبة له، منزلها عما يستحيل عليه. وملائكته: بأنهم عباد الله المكرمون، لا يعصون الله ما أمرهم، ويفعلون ما يؤمرون وبأنهم سُفَر (فرستادہ) اللہ بینہ و بین خلقہ. وكتبه: بأنها كلام الله تعالى الأزلي القديم، المنزه عن الحروف والأصوات، وبأنه تعالى أنزلها على بعض رسله بالفاظ حادثة في ألواح أو على لسان ملك. ورسله: بأنه أرسلهم إلى الخلق لهدايتهم، وأيدهم بالمعجزات، وبأنهم معصومون من الصغائر والكبائر قبل النبوة وبعدها. واليوم الآخر: وهو من الموت إلى آخر ما يقع يوم القيامة. وفي بعض النسخ والبعث بعد الموت: فهو إمتا كيد لليوم الآخر وإما من عطف الخاص على العام.

وَنَحْنُ مُؤْمِنُونَ بِذَلِكَ كُلِّهِ، لَانْفَرَقَ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ وَنَصَدَقَهُمْ كُلَّهُمْ عَلَى مَا جَاؤُوا بِهِ.

ہم ان تمام باتوں پر ایمان رکھتے ہیں، رسولوں میں سے کسی میں تفریق نہیں کرتے اور وہ جو پیغام لائے تھے اس کی تصدیق کرتے ہیں۔

بذلک: سے اشارہ ہے، ان تمام مذکورہ امور کی طرف، جن پر تفصیل ایمان لانا واجب ہے۔ لانفراق بین احد من رسلہ: اي لانفراق بينهم بأن تؤمن ببعض، ونكفر ببعض، بل تؤمن بهم ونصدقهم كلهم. یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح کام نہیں کرتے۔ جیسے یہود نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نبی

مانا، مگر خاتم الانبیاء ﷺ کو نبی نہ مانا۔ وکذلك لانفرق بين أحد من كتبه.

وأهل الكبائر من أمة محمد ﷺ في النار لا يُخلَّدون إذا ماتوا وهم موحدون وإن لم يكونوا تائبين بعد أن لقوا الله عارفين مؤمنين وهم في مشيئته وحكمه، إن شاء غفر لهم وعفاه عنهم بفضلهم، كما ذكر عز وجل في كتابه ﴿وَيَغْفِر مَادُونَ ذَلِكَ لِمَن يَشَاءُ﴾ وإن شاء عذبهم في النار بعد له، ثم يُخرجهم منها برحمته، وشفاعة الشافعين من أهل طاعته، ثم يعينهم إلى جنته؛ وذلك بأن الله تعالى مولى أهل معرفته، ولم يجعلهم في الدارين كأهل نُكرته الذين خابوا من هدايته ولم ينالوا من ولايته. اللهم ياولي الإسلام وأهله، مَسْكِنًا بِالْإِسْلَامِ حَتَّى نَلْقَاكَ بِهِ.

آنحضرت ﷺ کی امت میں سے کبیرہ گناہ کے ارتکاب کرنے والے جہنم میں جائیں گے، لیکن وہ اس میں ہمیشہ نہیں رہیں گے، درآنحالیکہ موت کے وقت وہ موحدین ہو، اگرچہ کبیرہ گناہوں سے توبہ نہ کی ہو، لیکن اللہ تعالیٰ سے جب ملے ہوں تو توحید باری تعالیٰ کی معرفت اور اللہ کی ذات پر، مؤمن ہونے کی حالت میں ملے ہوں، ایسے لوگ اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکم کے تحت ہوں گے اگر وہ چاہے، تو ان کو بخش دے اور انہیں اپنے فضل و کرم سے معاف کر دے، جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب میں تذکرہ فرمایا: ”شُرک کے علاوہ اور گناہ جس کو چاہے معاف کر دے“ اور اگر وہ چاہے تو انہیں جہنم میں اپنے عدل و انصاف کے مطابق سزا دے، پھر انہیں اس سے اپنی رحمت اور اپنے فرمانبردار بندوں کی سفارش کی بناء پر نکال دے اور انہیں جنت میں داخل کر دے، یہ اس لئے ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دوست بنایا ہے اور انہیں دنیا و آخرت میں منکرین کے برابر قرار نہیں دیا، جو ہدایت الہی سے محروم رہے اور اس کی دوستی کو نہ پاسکے۔ اے اللہ! اے اسلام اور اہل اسلام کے دوست! ہمیں اسلام پر ثابت قدم رکھ، حتیٰ کہ تجھ سے اسی حالت میں ملاقات کریں۔

وأهل الكبائر رد لقول الخوارج والمعتزلة، القائلين،

بتخليد أهل الكبائر في النار.

غرضیکہ اللہ چاہے، تو گناہ کو معاف کر سکتا ہے اور اگر چاہے تو گرفت کر سکتا ہے، معاف کرنا اس کا فضل و احسان ہے اور گرفت کرنا اس کا عدل ہے۔

من أمة محمد ﷺ: الإشكال: تخصيصه أمة محمد ﷺ، يفهم منه أن أهل الكبائر من أمة غير محمد ﷺ، حكمهم مخالف لأهل الكبائر من أمة محمد.

الجواب: (۱) ليس في بعض النسخ ذكر الأمة. (۲) المراد جميع أمم الأنبياء عليهم الصلاة والسلام وخصه بالذكر إما لا تفاق الحكم في جميع الأمم فإذا علم حكم أمته علم الحكم في جميع الأمم الماضية حيث كانوا كلهم جاؤوا بالتوحيد.

في النار: معمول لقوله: "لا يُخلّدون." عارفين: له بالتوحيد. مؤمنين: به، فيه رد على الجهمية القائلين بمعرفته فقط وإلا فابليس يعرفه وشفاعة الشافعين من أهل طاعته: كإنيائنه ورُسله وأهل معرفته وذلك بإذنه ومشيتته للأحاديث الكثيرة المتواترة. أهل معرفته: أي أهل الإيمان أهل نكرته: أي الكفار، بأن الله مولى لأهل معرفته: كما قال تعالى: ﴿ذَلِكَ بَانَ لِلَّهِ مَوْلَى الَّذِينَ آمَنُوا وَأَنَّ الْكَافِرِينَ لَا مَوْلَى لَهُمْ﴾ مسكنا: بعض نسخوں میں اس کی جگہ "ثبتنا" ہے، دونوں کا مفہوم ایک ہے، یعنی اسلام پر استقامت کی دعاء۔

وَنَرَى الصَّلَاةَ خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ مِنْ أَهْلِ الْقِبْلَةِ، وَنُصَلِّيَ عَلَى مَنْ مَاتَ مِنْهُمْ.

ہم اہل قبلہ (مسلمانوں) میں سے ہر نیک و گناہ گار امام کے پیچھے نماز پڑھنے کو درست سمجھتے ہیں اور اسی طرح ہر نیک اور گناہ گار کی نماز جنازہ پڑھنا شرعاً جائز سمجھتے ہیں۔

ونرى الصلاة: أي جائزة. خلف كل برّ: مهتد. وفاجر: مُعتدٍ حيث كان. من أهل القبلة: لقوله ﷺ: "صَلُّوا خَلْفَ كُلِّ بَرٍّ وَفَاجِرٍ" (أجرجه البيهقي في السنن والفتح الكبير) ولأن علماء الأمة كانوا يُصلُّون خلف الفسقة، وأهل الأهواء، والبدعة من غير نكير وفي صحيح البخاري: أن عبد الله بن عمر رضى الله عنهما كان يصلي خلف الحجاج بن يوسف الثقفي، وكذا أنس بن مالك رضي الله عنه، وكان الحجاج فاسقاً ظالماً وما نقل عن بعض السلف من المنع عن الصلاة خلف المبتدع فمحمول على الكراهية، إذ لا كلام في كراهية الصلاة خلف الفاسق والمبتدع وهذا إذا لم يؤد الفسق أو البدعة إلى حد الكفر وإلا فلا كلام في عدم جواز الصلاة خلفه. كذا في شرح العقائد.

ونصلي على من مات منهم: أي ونرى الصلاة (نماز جنازه) على من مات من الأبرار والفجار بالشرط المتقدم. حديث میں ہے: "والصلوة واجبة على كل مسلم برا كان أو فاجرا وإن عمل الكبائر." (ابوداؤد، مشکوٰۃ، باب الإمامة/ ۱۰۰)

البتہ اس عموم سے باغی لوگ، قطاع الطريق، اور وہ منافق جس کا نفاق معلوم ہو، مستثنیٰ ہیں، کیونکہ ان پر نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، کیونکہ فقہاء کرام نے ان لوگوں کی نماز جنازہ پڑھنے سے زجر منع کیا ہے۔ واضح رہے کہ قطاع الطريق اگر عین جنگ کے موقع پر قتل کر دیئے جائیں، تو نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی۔ ورنہ پڑھی جائے گی، خود کشی کرنے والے کی بھی نماز جنازہ پڑھی جائے گی، (الشامی: باب صلاة الجنائز) والدین کے قاتل کو اگر امام نے قصاصاً قتل کیا ہو، تو اس کی نماز جنازہ نہیں پڑھی جائے گی، اگر طبعی موت مرا ہو پھر پڑھی جائے گی۔

ولا نُنزل أحداً منهم جنّةً ولا ناراً ولا نشهد عليهم بالكفر ولا
بشركٍ ولا بنفاقٍ، ما لم يظهر منهم شيء من ذلك ونذر
سرائرهم إلى الله تعالى.
اہل قبلہ میں سے، ہم کسی فرد کو جنتی یا جہنمی قرار نہیں دیتے (قطعی اس کو جنتی یا
دوزخی نہیں کہتے) اور نہ ہی کسی پر کفر، شرک یا نفاق کی شہادت دیں گے۔ تا وقتیکہ
ان چیزوں (کفر، شرک وغیرہ) کا ان سے ظہور نہ ہو جائے۔ ہم ان کی پوشیدہ
باتوں (چھپی ہوئی) کو اللہ تعالیٰ کے سپرد کرتے ہیں۔

یرید: انا لانقول عن أحد معین من أهل القبلة: أنه أهل الجنة
أو من أهل النار، لأن حقيقة باطنه، ومآلات عليه لانهيط به، لكن نرجو
للمحسن، ونخاف على المسيء (گناہ گار) ولا نشهد عليهم....: لانا قد
أمرنا بالحكم الظاهر ونهينا عن الظن واتباع ما ليس لنا به علم. ہاں عشرہ مبشرہ
وغیرہم کے بارے میں ہم جنتی ہونے کا یقین رکھتے ہیں، کیونکہ ان کی جنتی ہونے کی خبر، خود
حضور ﷺ نے دی ہے۔

بہر حال تکفیر کے مسئلہ میں احتیاط کی ضرورت ہے، حدیث پاک ہے: ”من
دعا رجلاً بالكفر أو قال عدو الله وليس كذلك إلا حارّ عليه“ (مسلم
ج: ۱، ص ۷۵)۔ جس شخص نے کسی مسلمان پر کافر ہونے کا اتہام لگایا، اللہ کا دشمن کہا وہ خود
کافر ہو گیا۔

حاصل یہ کہ مسلمان کو کافر کہنے والا خود کافر بن جاتا ہے، مگر اس کا یہ مطلب ہرگز
نہیں، کہ واقعی اور یقینی کافر کو، کافر نہ کہا جائے۔ علامہ انور شاہ کشمیریؒ لکھتے ہیں: ”فليس من
الدين أن يغمض عن كافر كما ليس من الدين أن يكفر المسلم.“ (اكفار
الملحدین: ۵۳)۔ قد اشتهر أن المؤول لا يكفر وهو على ظاهر إطلاقه غير
صحيح، فإن المؤول في ضروريات الدين كافر كما صرح به الخيالي.
(معارف السنن: ۳۵۸/۱)

ولا نرى السيف على أحد من أمة محمد ﷺ إلا من وجب عليه السيف.

ہم امت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں سے کسی فرد پر تلوار چلانا جائز نہیں سمجھتے، مگر جس پر تلوار کا چلنا واجب ہو جائے۔

لا نرى السيف: یعنی خون بہانا واجب نہیں سمجھتے۔ إلا من وجب عليه السيف: أي إلا على من وجب عليه السيف أي سفك الدم بالنص القاطع كالمقاتل والزاني المحصن والمرتد. ففي البخاري ومسلم عن ابن مسعود رضي الله تعالى عنه عن النبي ﷺ أنه قال: "لا يحل دم امرئ مسلم يشهد أن لا إله إلا الله وأني رسول الله إلا بإحدى ثلاث. الثيب الزاني، والنفس بالنفس والتارك لدينه، المفارق للجماعة. دوسرے موقع پر ایک مؤمن کی جان کی قدر و قیمت دنیا سے بڑھ کر بتائی گئی ہے۔ فرمایا: "قتل المؤمن أعظم عند الله من زوال الدنيا". (نسائی، مجمع الفوائد)

وَلَا نَرَى الْخُرُوجَ عَلَى أَمْتِنَا وَوَلَاةَ أُمُورِنَا وَإِنْ جَازَوْا وَلَا نَدْعُوا عَلَيْهِمْ، وَلَا نَنْزِعُ يَدًا مِنْ طَاعَتِهِمْ وَنَرَى طَاعَتَهُمْ مِنْ طَاعَةِ اللَّهِ عَزَّوَجَلَّ فَرِيضَةً مَالٍ يَأْمُرُوا بِمَعْصِيَةٍ وَنَدْعُوهُمْ بِالصَّلَاحِ وَالْمُعَافَاةِ.

ہم اپنے ائمہ اور مسلمان حکمران کے خلاف خروج اور بغاوت کو جائز نہیں سمجھتے، اگرچہ وہ ظالم ہی کیوں نہ ہوں اور نہ ہی ہم انہیں بدعادی دیتے ہیں اور نہ ہی ان کی اطاعت سے اپنا ہاتھ کھینچتے ہیں، جب تک وہ کسی گناہ کا حکم نہ دیں ہم ان کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت کا حصہ سمجھتے ہیں جو کہ فرض ہے اور ہم ان کے لئے ان کی نیت کی درنگی اور برائی سے بچنے کی دعاء کرتے ہیں۔

کسی ضرورت کے بغیر حکام کی علی الاعلان اہانت شرعاً پسندیدہ نہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی روایت ہے کہ: "لَا تَشْغُلُوا قُلُوبَكُمْ لِسَبِّ الْمُلُوكِ، وَلَكِنْ تَقَرَّبُوا إِلَى اللَّهِ تَعَالَى بِالْدُّعَاءِ لَهُمْ، يُعْطِفَ اللَّهُ قُلُوبَهُمْ عَلَيْكُمْ."

اپنے دل بادشاہوں کو برا بھلا کہنے میں مشغول نہ کرو، بلکہ ان کے حق میں دعاء کر کے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کرو، اللہ تعالیٰ ان کے دلوں کو تمہاری طرف متوجہ فرمادیں گے۔ (کنز العمال: ۲۸۶)

بلاوجہ حکومت کی ہر بات میں کیڑے نکالنا اور اس کی کسی اچھائی کا اعتراف نہ کرنا ایسے ہی حکومت کی مخالفت کو بذات خود ایک مقصد بنالینا قطعاً درست نہیں۔ امام غزالیؒ نے اس ذہنیت کی تردید کی ہے کہ: ہر مصیبت اور پریشانی پر حکمرانوں کو برا کہتے رہو اور ان کے خلاف تحریکیں چلاتے رہو اور یہ نہ دیکھو کہ خود تمہارا حال کیا ہے؟ یہاں تین باتیں ہیں۔ (۱) حکومت عادلہ کے خلاف بغاوت حرام ہے۔ (۲) اور اگر حکمران سے کفر بـسـواح (واضح کفر) کا صدور ہو جائے تو اس کے خلاف بغاوت بالکل برحق ہے، لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ خروج کے لئے مناسب قوت موجود ہو اور اس کے نتیجے میں کسی اور بدتر حکمران کے مسلط ہو جانے یا کسی غیر مسلم طاقت کے قبضہ جمالینے کا اندیشہ نہ ہو۔ (۳) اگر حکمران سے فسق و فجور (مثلاً زنا، شرب خمر، بندوں پر ظلم و زیادتی وغیرہ) سرزد ہو اور بندوں پر ظلم و زیادتی کرے پھر بھی ان کی اطاعت و فرمانبرداری کرنی چاہئے ان کے خلاف بغاوت جائز اور مناسب نہیں، کیونکہ سلف نے ایسے حکمرانوں کی طاعت کی ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حکمران کے معزول ہونے اور اس کی جگہ دوسرے امام کے تقرر کی صورت میں فتنہ کا اندیشہ ہے، جسے آسانی سے دبایا نہیں جاسکتا۔ الغرض فاسق حکمران کا حکم یہی ہے کہ اگر کسی طاعت کا حکم دے تو اس کی اطاعت کی جائے اور معصیت کا حکم دے تو اس کا ساتھ نہ دیا جائے۔ کیونکہ اللہ کے رسول ﷺ کا ارشاد ہے: ”لا طاعة لمخلوق في معصية الخالق.“ (رواہ احمد و حاکم)

ولاندعوا عليهم: حکمرانوں کے حق میں بددعائی کی ضرورت نہیں، کبھی اللہ تعالیٰ ہمارے بُرے اعمال کی وجہ سے ظالم حکمرانوں کو مسلط کر دیتے ہیں، لہذا اگر باب حکومت کو کوکنے کے بجائے اللہ کی طرف رجوع ہو۔ جب نادر شاہ نے دلی کو تاراج کیا اور اور دلی والوں پر مصائب کے پہاڑ ٹوٹے، تو اس وقت کے عارف حضرت مرزا مظہر جان جاناںؒ نے فرمایا تھا: ”شامت اعمال ما صورت نادر گرفت“

ونرى طاعتهم: یعنی امیر کا حکم اگر خلاف شریعت نہیں ہے، تو بہر حال اس کی اطاعت کی جائے، لیکن گناہ میں کسی کی اطاعت نہیں۔

وَتَتَّبِعُ السُّنَّةَ وَالْجَمَاعَةَ وَنَجْتَبِ الشُّذُوزَ وَالْخِلَافَ وَالْفُرْقَةَ.
ہم سنت اور جماعت کی پیروی کرتے ہیں اور مسلمانوں کی جماعت سے علیحدگی، مخالفت اور افتراق سے اپنے آپ کو بچاتے ہیں۔

السنة: طريقة الرسول ﷺ. والجماعة: جماعة المسلمين وهم الصحابة والتابعون.

اللہ کے رسول ﷺ نے فرمایا: ”إن هذه الأمة ستفترق على ثلاث وسبعين ملةً - یعنی الأهواء - كلها في النار إلا واحدة، وهي الجماعة.“
وفي رواية: ”قالوا: من هي يا رسول الله؟“ قال: ”ما أنا عليه وأصحابي“
(الترمذي رقم الحديث: ۲۶۴۱)

غرضیکہ اہل سنت والجماعت درحقیقت جماعت المسلمین اور اسلام کی اصل روح اور حقیقی تصویر ہے اور اسی نام کے ساتھ اسلام کی خدمت چودہ سو سال سے ہو رہی ہے، مگر صد افسوس! کہ جناب ڈاکٹر مسعود احمد صاحب نے تیس سال قبل تاریخ کے مسلمہ اور مسلمانوں کے امتیازی نام ہٹا کر صرف پاکستان کی سطح پر شرذمہ قلیلہ ”جماعت المسلمین پاکستان“ کو رجسٹرڈ کروا کر ساری دنیا کے مسلمانوں کو غیر مسلم قرار دیا۔

وَنُحِبُّ أَهْلَ الْعَدْلِ وَالْأَمَانَةِ، وَنُبْغِضُ أَهْلَ الْجَوْرِ وَالْخِيَانَةِ.
ہم اہل عدل و امانت سے محبت کرتے ہیں، ظالموں اور خیانت کا ارتکاب کرنے والوں سے نفرت کرتے ہیں۔

ونحب: یہ دراصل محبت اور بغض کی حقیقت ہے۔

حدیث پاک: ”مَنْ أَحَبَّ لِلَّهِ وَأَبْغَضَ لِلَّهِ وَأَعْطَى لِلَّهِ وَمَنْعَ لِلَّهِ فَقَدْ اسْتَكْمَلَ الْإِيمَانَ“ (ابوداؤد) میں یہی بات ذکر ہے۔

ونقول: اللّٰهُ اَعْلَمُ، فيما اشتبه علينا علمه.
اگر کسی چیز کے بارے میں ہمیں شک و شبہ ہو جائے تو ہم اس مقام پر اللہ اعلم
(اللہ بہتر جانتا ہے) کہتے ہیں۔

علامہ طحاویؒ کا کلام، اس سے قبل بھی گزر چکا ہے، یعنی ”انہ ما سلم فی دینہ
إلا من سلم للہ عزوجل ولرسولہ ﷺ، ورد علم ما اشتبه علیہ إلی عالمہ.
وقد أمر اللہ نبیہ ﷺ أن یرد علم ما لا یعلم إلیہ، فقال تعالیٰ ﴿قل
اللّٰهُ اَعْلَم بما لبثوا له غیب السموات والارض﴾ (الکہف: ۲۶)
﴿قل ربی اَعْلَم بعدتہم﴾ (الکہف: ۲۲)

وقد قال صلی اللہ علیہ وسلم: لما سُئل عن أطفال المشرکین:
”اللّٰهُ اَعْلَم بما كانوا عاملین“ (أخرج البخاری ۱۱۳۸۳، ومسلم ۲۶۵۹)
بہر حال جن چیزوں کا ہمیں علم نہیں، ان کے بارے میں ہم کہہ دیں گے: ”اللّٰهُ
اعلم“ یہی علماء محققین کا طریقہ ہے۔ عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں: ”إن من أفتی
الناس فی کلّ ما یسألونه عنه لمجنون.“ جو شخص پوچھنے والے کے ہر سوال کا جواب
بے سمجھ دینے لگے وہ پاگل ہے۔ (اعلام الموقعین: ج ۱/۱)

ونرى المسح على الخفين في السفر والحضر كما جاء في الآثار.
سفر حضر میں ہم موزوں پر مسح جائز سمجھتے ہیں، جیسے کہ آثار میں منقول ہے۔

”مسح علی الخفین“ کے جواز پر اجماع ہے، کیونکہ اس سلسلے میں رسول اللہ
ﷺ سے تواتر کے ساتھ احادیث منقول ہیں۔ والرافضة تخالف هذه السنة
المتواتره. روافض ”مسح علی الخفین“ کی بجائے مسح رجلیں کے قائل ہیں۔ حضرت
حسن بصریؒ کا قول مروی ہے۔ قال: حدثنی ”سبعون رجلاً من أصحاب النبی ﷺ
أنه مسح علی الخفین“ (معارف السنن ج ۱، ص ۳۳۱)

وقال الکرخي: أخاف الکفر علی من لم یرى المسح علی
الخفین لأن الآثار جاءت فیہ، فی حیث التواتر. وعن أبي حنيفة: ما قلت

حتى جاءني فيه مثل ضوء النهار، وروى عن أبي حنيفة أنه سئل عن مذهب أهل السنة والجماعة فقال: هو أن تفضلَ الشيخين (ابوبكر وعمر) وأن تحبَ الخنسين (عثمان وعلي) وأن ترى المسح على الخفين. (شرح النية) در اصل مسئلہ ”مسح علی الخفین“ کا تعلق تو علم فقہ سے ہے، لیکن چونکہ روافض نے اس کا انکار کیا ہے، اس لئے ان کے مقابلے میں اس مسئلے کا اقرار اہل السنۃ والجماعۃ کی خاص علامت بن کر کتب عقائد میں مذکور ہوا۔ در مختار میں ہے کہ مسح علی الخفین کا ثبوت سنت مشہورہ سے ہے اور راوی حدیث مسح علی الخفین کے ۸۰ صحابہ رضی اللہ عنہم سے زیادہ ہیں اور ان میں عشرہ مبشرہ بھی ہیں۔

والحج والجهاد ماضيان، مع أولى الأمر من المسلمين، برّهم وفاجرهم إلى قيام الساعة، لا يبطلها شيء ولا ينقضهما. مسلمانوں میں سے نیک و بد حکمرانوں کے (یعنی انکی معیت میں) ساتھ حج اور جہاد، قیامت تک جاری رہیں گے ان کو کوئی چیز نہ تو ختم کر سکتی ہے اور نہ توڑ سکتی ہے۔

يشير الشيخ إلى الرد على الرافضة، حيث قالوا: لا جهاد في سبيل الله حتى يخرج الرضاء من آل محمد ﷺ، وينادي منادٍ من السماء: اتبعوه. مع أولى الأمر: أي مع الصّحة مع أولى الأمر. برّهم: عادلهم فاجرهم: ظالمهم، لأن برّ الإمام ليس بشرط، لصحتهما، ولأن الحج والجهاد فرضان يتعلقان بالسفر، فلا بد من سائس يسوس الناس فيهما ويقاوم العدو، وهذا المعنى كما يحصل بالإمام البر يحصل بالإمام الفاجر.

وقد كان السلف من الصحابة والتابعين يحجّون ويجهدون مع كل إمام، برّ أو فاجر من غير نكير فكان ذلك إجماعاً.

غرضیکہ حج اور جہاد دونوں میں انتظام کی ضرورت ہے اور انتظام جیسے امام عادل کی طرف سے ہو سکتا ہے، فاسق و فاجر بھی اس کا نظم و نسق کر سکتا ہے۔

کراما کاتین

وَنُؤْمِنُ بِالْكَرَامِ الْكَاتِبِينَ، فَإِنَّ اللَّهَ قَدْ جَعَلَهُمْ عَلَيْنَا حَافِظِينَ.
ہم ”کرام کاتین“ پر بھی ایمان رکھتے ہیں کہ بے شک انکو اللہ تعالیٰ نے
ہمارا محافظ بنایا ہے۔

دراصل فرشتے دو قسم کے ہیں (۱) دوفرشتے اللہ کے حکم سے ہر وقت انسان کی تاک میں لگے رہتے ہیں، جو لفظ اس کے منہ سے نکلے وہ لکھ لیتے ہیں، نیکی داہنے والا اور بدی بائیں والا۔ چنانچہ (سورہ ق آیت: ۱۷) ﴿إِذْ يَتَلَقَّى الْمُتَلَقِّينَ عَنِ الْيَمِينِ وَعَنِ الشِّمَالِ قَعِيدٌ﴾ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ (۲) دوسری قسم وہ فرشتے ہیں، جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے موافق ان بلاؤں کے دفع کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں، جن سے حق تعالیٰ بندہ کو بچانا چاہتے ہیں۔ چنانچہ (سورہ رعد آیت: ۱۱) میں ارشاد ہے۔ ﴿لَهُ مَعْقِبَتٌ مِّنْ بَيْنِ يَدَيْهِ وَمِنْ خَلْفِهِ يَحْفَظُونَهُ مِنْ أَمْرِ اللَّهِ﴾۔

ہر شخص کی حفاظت کے لئے کچھ فرشتے مقرر ہیں، جن کی بدلی ہوتی رہتی ہے، کچھ اس کے آگے اور کچھ اس کے پیچھے کہ وہ بحکم خدا بہت بلاؤں سے اس کی حفاظت کرتے ہیں۔

وفي الصحيح البخاري عن النبي ﷺ أنه قال: ”يتعاقبون فيكم ملائكة بالليل وملائكة بالنهار، ويجتمعون في صلاة الصبح وصلاة العصر، فيصعد إليهم الذين كانوا فيكم، فيسألهم. وهو أعلم بهم، كيف تركتم عبادي؟ فيقولون: أتيناهم وهم يُصلُّون، وفارقناهم وهم يُصلُّون۔ ترمذی کی روایت میں ہے: إن معكم من لا يفارقكم إلا عند الخلاء وعند الجماع فاستحيوهم وأكرمواهم۔“

الحاصل یہ محافظ فرشتے دین و دنیا دونوں کی مصیبتوں اور آفتوں سے انسان کی سوتے جاگتے حفاظت کرتے رہتے ہیں۔

ثم قد ثبت بالنصوص أن الملائكة تكتب القول والفعل، وكذلك النية، لأنها فعل القلب، فدخلت في عموم ”يعلمون ماتفعلون“۔

ملک الموت

وَنُؤْمِنُ بِمَلِكِ الْمَوْتِ الْمُؤَكَّلِ بِقَبْضِ أَرْوَاحِ الْعَالَمِينَ.
ہم ملک الموت پر بھی ایمان رکھتے ہیں، جسے اللہ تعالیٰ نے روحیں قبض کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے۔

”ملک الموت“ سے مراد، عزرائیل علیہ السلام ہے، لیکن ﴿الَّذِينَ تَتَوَفَّيهِمُ الْمَلَائِكَةُ﴾ اور ﴿حَتَّىٰ إِذَا جَاءَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا﴾ میں ”ملائکہ“ اور ”رُسل“ بلفظ جمع لایا گیا ہے، اس میں اشارہ ہے کہ حضرت عزرائیل علیہ السلام تنہا یہ کام انجام نہیں دیتے، بلکہ عوامان اور مددگار کی حیثیت سے ان کے ماتحت بہت سے فرشتے اس میں شریک ہوتے ہیں۔ ﴿قُلْ يَتَوَفَّكُم مَّلِكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ﴾ میں اگرچہ ملک الموت واحد کا صیغہ ہے، لیکن درحقیقت یہ واحد کا صیغہ نہیں، بلکہ اسم جنس ہے جو قلیل اور کثیر دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ یا پھر یہ واحد ہی کا صیغہ ہے، مگر قبض ارواح کی نسبت صرف ملک الموت (عزرائیل) کی طرف اس لئے ہے کہ وہی ذمہ دار اور امیر ہے اس طرح آیات میں تعارض نہیں رہے گا۔

امام تفسیر، مجاہد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ: ساری دنیا ملک الموت کے سامنے ایسی ہے جیسے کہ انسان کے سامنے ایک گھلے طشت میں دانے پڑے ہوں وہ جس کو چاہے اٹھالے، یہ مضمون ایک مرفوع حدیث میں بھی آیا ہے، ”ذکرہ القرطبی فی التذکرہ“ (بحوالہ معارف القرآن: ۶۷/۷)

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ فرشتے کے ذریعے قبض روح انسان کے لئے مخصوص ہے اس کی شرافت و کرامت کے لئے، باقی جانور باذن خداوندی بغیر واسطہ فرشتے کے مرجائیں گے۔

فائدہ: ملک الموت، کسی کی موت کا وقت پہلے سے نہیں جانتا جب تک کہ اس کو حکم نہ دیا جائے کہ فلاں کی روح قبض کر لو۔ (اخرجہ احمد وابن ابی الدنیاء عن معمر، مظہری)

عذاب قبر

وبعذاب القبر لمن كان له أهلاً.
اور جو شخص قبر کے عذاب کا مستحق ہو اس کے لئے عذاب فی القبر پر ہم یقین رکھتے ہیں۔

وبعذاب القبر: أي نؤمن بعذاب القبر - ما قبل "بملك الموت" پر عطف ہے۔ "لمن كان له أهلاً" قبر کے عذاب ک کے مستحق اور اہل، تمام کفار ہیں اور بعض گناہ گار اہل ایمان بھی مستحق ہیں، مگر بعض دیگر گناہ گار مومنین کو قبر میں عذاب نہیں ہوگا۔ مثلاً شہید کے بارے میں روایت ہے: "وَيُجَار من عذاب القبر" شہید کو عذاب سے محفوظ کر دیا جاتا ہے۔ (ترمذی)۔ جہاد کے سلسلے میں پہرہ داری کرنے والے کے بارے میں روایت ہے۔ "ومن مات فيه وُقي فتنة القبر" جو پہرہ داری کے دوران مر جائے، اسے فتنہ قبر سے نجات دے دی جائیگی، ترمذی کی ایک اور روایت ہے "من قتله بطنه لم يُعَذَّب في قبره" جو پیٹ کی بیماری سے مر گیا، اسے عذاب قبر نہیں ہوگا۔ ہر رات سورۃ ملک پڑھنے والا عذاب قبر سے محفوظ ہوگا (نسائی)۔ ماہ رمضان میں مسلمان عاصی وفات پا جائے تو اس کو قیامت تک عذاب قبر سے امن ہو جاتا ہے ایسے ہی جو مسلمان عاصی جمعہ کے دن یا جمعہ کی رات مر جائے اس کا عذاب قبر معاف ہے۔ (شامی، آخر الجنازہ)

عذاب قبر کے سلسلے میں چار امور قابل ذکر ہیں۔

(۱) جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کے نزدیک عذاب و تعذیم کا تعلق جسد مع الروح سے ہے، روح چاہے ساتویں آسمان کے اوپر ہو یا سحین میں ہو، مگر اس کا تعلق بدن غصری کے ساتھ اس طرح ہوگا جس طرح آسمان سے سورج کی شعاع زمین پر پڑتی ہو، روح کے ادنیٰ تعلق سے مردہ کے جسم میں "نوع من الحیاة" پیدا ہو جاتی ہے جس سے عذاب و ثواب کا ادراک کر سکے، لیکن روح کا یہ تعلق تدبیر و تصرف کا نہیں ہے، وہ تو دنیا میں تھا، اور ختم ہو گیا، ایسا تعلق دوبارہ صرف آخرت میں ہوگا، عالم برزخ میں روح کا تعلق ایسا نہیں ہوگا جیسے دنیا

میں تھا، بلکہ اس تعلق سے ایک خاص قسم کی حیات اتنی مقدار میں آجائے گی جس سے عذاب و ثواب کا ادراک کر سکے۔ فلان عود الروح إلى الجسد ليس على الوجه المعهود في الدنيا، بل تعاد الروح إليه إعادة غير إعادة المألوفة في الدنيا.

(شرح عقيدة الطحاوية: ص ۴۰۰)

(۲) مردہ کا جسم جب حُفْرۂ (گڑھے) میں رکھا جاتا ہے، تب تو اشکال نہیں، کیونکہ عذاب و ثواب کا معاملہ اسی جگہ ہوگا، جہاں جسم رکھا گیا ہے، یعنی مدفن ارضی میں اور یہی عام ہے، لیکن بعض دفعہ کچھ شاذ و نادر صورتیں بھی پیش آتی ہیں، جیسے دریا میں غرق شدہ شخص اور وہ شخص جس کو درندے کھا گئے ہوں اور جس کو ہوا میں پھانسی چڑھا دیا گیا ہو اور جس کے جسم کو جلا کر راکھ کر دیا گیا ہو، اور کبھی جسم کے اجزاء خاک میں مل جاتے ہیں پھر بھی ان سب کو عذاب ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ جسم کے کل یا بعض اجزاء منتشرہ سے روح کا تعلق قائم کر کے ان میں نوع من الحیات پیدا کر کے درد، لذت، دکھ اور سکھ کا شعور ان اجزاء میں پیدا کر دے یہ بات قادر مطلق پر نہ مشکل ہے اور نہ ممنوع ہے۔ غرضیکہ بندہ کو دنیا کے بعد اور آخرت سے پہلے درمیانی وقفے یعنی عالم برزخ سے واسطہ پڑے گا خواہ وہ قبر میں ہو یا کسی اور جگہ ہو۔

(۳) رہی یہ بات کہ ہمیں تو میت کے جسم پر کوئی معاملہ (عذاب و تعظیم کا) ہوتا نظر نہیں آتا، تو محض یہ شبہ انکار عذاب قبر و تعظیم قبر کا باعث نہیں بن سکتا، کیونکہ کسی شی کی عدم رویت، عدم وجود کی دلیل نہیں ہوتی، جنات، فرشتے اور ہوا بھی کسی کو نظر نہیں آتی، مگر ایک حقیقت ہے خواب دیکھنے والا خواب میں کسی مصیبت میں گرفتار ہو کر سخت عذاب میں بے چین ہوتا ہے، مگر پاس بیٹھنے والوں کو اس کی کچھ خبر نہیں ہوتی، اسی طرح عذاب قبر کے إخفاء عن الناس میں بھی حکمتیں ہیں، ایک عالم (عالم برزخ و قبر) کو دوسرے عالم (عالم دنیا) پر قیاس کرنا غلط ہے لہذا عالم برزخ و قبر کے علم کا ذریعہ صرف وحی الہی ہے۔

(۴) خوارج، بعض، مرجئہ اور بعض معتزلہ کے علاوہ موجودہ زمانہ کے آزاد خیال اور منکرین حدیث نے بھی عذاب قبر کا بالکل انکار کیا ہے، اس سلسلے میں وہ کچھ شبہات

پیش کرتے ہیں، ماقبل کی تفصیل سے وہ شبہات خود بخود ختم ہو جاتے ہیں۔
محمد بن جریر کرامی اور عبداللہ بن کرام اور ابوالحسن صالحی وغیرہ کے نزدیک عذاب صرف جسم بے جان پر ہوتا ہے، لیکن جب جسم میں کسی قسم کی بھی حیات نہ ہو، اس پر عذاب ماننے کا کیا معنی ہے؟

ابن حزم ظاہری اور ابن نیسرہ صرف اور صرف روح پر عذاب و ثواب مانتے ہیں، لیکن جمہور اہل سنت کے مذہب کی تفصیل گزر چکی ہے۔

وَسُؤَالُ مُنْكَرٍ وَنَكِيرٍ فِي قَبْرِهِ عَنْ رَبِّهِ وَدِينِهِ وَنَبِيِّهِ.
ہم قبر میں منکر و نکیر کے سوالات کو بھی یقین کے ساتھ مانتے ہیں جو سوالات وہ اللہ کی ذات، دین اور نبی اکرم ﷺ کے بارے میں پوچھیں گے۔

یہاں تین باتیں ہیں (۱) منکر: بفتح الکاف، کما فی القاموس، اسم مفعول من أنکرہ إذا لم يعرفه. نکیر: فعیل بمعنى مفعول من نکر بالکسر کلاهما ضد المعروف، سمیا بذلك لأن الميت لم يعرفهما ولم ير صورة مثل صورتهم. (طیبی، شرح مشکوٰۃ) کَانَ النکیر أیہب من المنکر حیث سمی بالمصدر (عصام)، یعنی ”نکیر“ ”منکر“ کے مقابلہ میں زیادہ دہشت والا ہے۔ ابن حجرؒ نے لکھا ہے کہ منکر نکیر گناہ گاروں کے لئے ہیں۔ اور بشر بشیر فرمان برداروں کے لئے ہیں۔ (فتح الباری: ۳۸۰/۳)

بہر حال منکر اور نکیر، دو فرشتے ہیں کہ قبر میں ہر بندہ سے آکر رب، دین اور نبی کے بارے میں سوال کریں گے، چنانچہ حضرت ابو ہریرہؓ کی روایت ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا: ”إِذَا أُقْبِرَ الْمَيِّتُ أَتَاهُ مَلَكَانِ أَسْوَدَانِ أَزْرَقَانِ يَقَالُ أَحَدُهُمَا الْمُنْكَرُ وَالْآخَرُ النُّكَيْرُ“ أَزْرَقَانِ: بتقديم الزاء المعجمة على الراء المهملة. اس کا واحد الأزرق ہے، نیلگوں آسمانی رنگ، نیلی آنکھ۔ منکر و نکیر کی اس مخصوص شکل کی بناء پر کفار اور منافقین پر دہشت اور رعب پڑے گا، مگر اہل ایمان کو اللہ حوصلہ اور استقامت نصیب فرمائیں گے۔ (مرقاۃ شرح مشکوٰۃ)

(۲) بعض نے کہا ہے کہ: ہو سکتا ہے سوال کرنے والے فرشتے بہت سے ہوں جن میں بعض کا نام منکر اور بعض کا نام نکیر ہو، سوال کے لئے ہر میت کے پاس ان میں سے دو فرشتوں کی تشکیل کی جاتی ہو، جس طرح ہر شخص کے کاتب اعمال فرشتے ہیں۔

(۳) راجح یہ ہے کہ نابالغ مسلم بچے چونکہ غیر مکلف ہیں، اس لئے ان سے نہ تو سوال ہوگا اور نہ ہی ان پر عذاب قبر ہوگا ایسے ہی انبیاء علیہم السلام سے سوال نہ ہوگا، کیونکہ جب امت کے بعض صلحاء سے از روئے حدیث سوال نہ ہوگا تو نبی سے بدرجہ اولیٰ نہ ہوگا۔ کفار کے بچوں کے بارے میں علماء کرام نے توقف کیا ہے۔

(۴) قال العلماء: فإن ظهر عن الميت أثر الاسلام سأل عنه المنكر وإن ظهر عنه الكفر سأل عنه النكير۔

على ما جاء ت به الأخبار عن رسول الله ﷺ وعن الصحابة رضوان الله عليهم۔
جس طرح کہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے اس کے بارے میں احادیث آئی ہیں۔

مرنے اور دفن ہونے کے بعد فرشتوں کے سوالات کا جواب دینا پھر اس امتحان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب یا عذاب کا ہونا قرآن مجید کی تقریباً دس آیات میں اشارۃً اور رسول کریم ﷺ کی ستر احادیث متواترہ میں بڑی صراحت و وضاحت کے ساتھ مذکور ہے۔ (ابن کثیر و شرح الصدور) یہی وجہ ہے کہ بہت سے فقہاء اور متکلمین نے منکرین عذاب قبر کی تکفیر کی ہے، حالانکہ فقہاء کسی کی تکفیر میں بہت احتیاط کرتے ہیں۔

نوٹ: واضح رہے کہ عذاب قبر کی کیفیت کو متعین کرنا دشوار ہے، یعنی قطعی طور پر اس کی کوئی صورت متعین کرنا کہ جس کے انکار کرنے والے کو کافر کہہ دیا جائے، ناممکن ہے یہی کہا جاسکتا ہے کہ عذاب قبر تو یقینی ہے اور اس پر ایمان لانا فرض ہے، لیکن اس کی حقیقت اور کیفیت کا علم اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ (ترجمہ: اکفار المسحدین، مقدمہ: ۶۵)

فائدہ: عذاب قبر کے بارے میں احادیث تو اتر لفظی کے قبیل سے نہیں، بلکہ یہ احادیث معنی کے اعتبار سے متواتر ہیں، اگرچہ ان کی جزئیات اور احاد درجہ تو اتر تک نہیں پہنچیں، مگر یہ سب احاد امر مشترک (عذاب قبر) پر متفق ہیں۔ یہ تو اتر معنوی کہلاتا ہے، تو اتر معنوی بھی تو اتر لفظی کی طرح قطعی حجت ہے، جو عقیدہ کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

والقبر روضة من رياض الجنة أو حفرة من حفرة النيران.
قبر جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔

یہ دراصل ترمذی کی حدیث ہے، جس کو طحاوی رحمۃ اللہ علیہ نے اقتباساً لیا ہے، اس حدیث میں عذاب قبر کے ساتھ ساتھ خاص کر تعظیم قبر کا بھی ذکر ہے۔
نیران: بالكسر جمع نار و آورده بلفظ الجمع بخلاف الجنة تھویلا۔ یعنی جمع کا صیغہ جہنم کی ہولناکی کی خاطر استعمال ہوا ہے۔

وَنُؤْمِنُ بِالْبَعْثِ وَجَزَاءِ الْأَعْمَالِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَالْعَرْضِ
وَالْحِسَابِ وَقِرَاءَةِ الْكِتَابِ وَالثَّوَابِ وَالْعِقَابِ وَالصِّرَاطِ وَالْمِيزَانِ.
ہم موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جانے، قیامت کے روز اعمال کی جزاء پیشی، حساب و کتاب، اعمال نامے کی قراءت، ثواب و عقاب، پل صراط اور میزان جیسے حقائق پر ایمان رکھتے ہیں۔

بعث کی تعریف

تعریف سے قبل بطور مقدمہ کے یہ سمجھئے کہ اجزاء انسانی کی دو قسمیں ہیں۔ (۱) اجزاء اصلیہ: کھانا کھانے سے پہلے انسان میں موجود اجزاء، جو ابتداء عمر سے لیکر آخر تک باقی رہتے ہیں۔ (۲) اجزاء فعلیہ: وہ زائد اجزاء جو کھانا کھانے کے بعد غذا سے حاصل

ہوں۔ اب بعث کی تعریف یہ ہے کہ ”البعث: ان يبعث الله تعالى الموتى من القبور۔“ یعنی جزاء و سزا کے لئے اللہ تعالیٰ کا، مردوں کو دوبارہ زندہ کرنا بعث کہلاتا ہے جس کی کیفیت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ ہر جسم کے اجزاء اصلہ کو جمع فرما کر دنیا میں جو روح اس جسم سے متعلق تھی، وہ روح اس جسم کی طرف لوٹا دیں گے، اس موقع پر روح کا رشتہ اور تعلق بدن سے حد درجہ مضبوط ہوگا، کیونکہ اس کے بعد بدن کو فساد، موت اور نیند کبھی نہیں آسکتی۔

عاص بن وائل یا ابی ابن خلف کا فر جب اپنے ہاتھ میں بوسیدہ ہڈیاں لیکر آیا اور حضور ﷺ کے سامنے کہنے لگا: ﴿مَنْ يُحْيِي الْعِظَامَ وَهِيَ رَمِيمٌ﴾ بھلا ان بوسیدہ ہڈیوں کو کون زندگی دے گا۔ (خازن) تو اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی: ﴿قُلْ يُحْيِيهَا الَّذِي أَنْشَأَهَا أَوَّلَ مَرَّةٍ﴾ اے نبی پاک بتلا دیجئے کہ: ان بوسیدہ ہڈیوں کو وہ اللہ زندہ کرے گا، جس نے انہیں پہلی بار پیدا کیا یہ اور اس طرح کی بے شمار آیات اور احادیث ہیں جو صاف اور صریح لفظوں میں بعث بعد الموت کی خبر دیتی ہے۔

وجزاء الأعمال يوم القيامة: قیامت کے روز اعمال کی جزاء پر ہم ایمان رکھتے ہیں۔ جیسے ارشاد ہے ﴿اليوم تجزي كل نفس بما كسبت لا ظلم اليوم ان الله سريع الحساب﴾ [مؤمن: ۱۷]

آج ہر شخص کو اس کے کئے کا بدلہ دیا جائے گا، آج کسی پر ظلم نہ ہوگا۔ اللہ بہت جلد حساب لینے والے ہیں۔ یا جیسے سورۃ السجدہ میں ہے ﴿جزاء ابما كانوا يعملون﴾ [السجدہ: ۱۷]
والعرض: پیشی پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں۔ والحساب: حساب و کتاب پر ہم یقین رکھتے ہیں۔ العرض حساب بھی ہوگا اور کسی پر فقط عرض ہوگا۔ عرض کا مطلب حساب یسیر ہے، چنانچہ بخاری کی ایک حدیث میں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ”من حوسب يوم القيامة عذب“ یعنی قیامت کے روز جس سے حساب لیا جائے وہ عذاب سے نہ بچے گا، اس پر حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے سوال کیا کہ: کیا قرآن میں حق تعالیٰ کا یہ ارشاد نہیں ہے: ﴿يَحْسَبُ حسابًا يسيرًا﴾ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ اس

آیت میں جس کو ”حساب یسیر“ فرمایا وہ درحقیقت مکمل حساب نہیں، بلکہ صرف رب العزت کے سامنے ”عرض“ پیشی ہے اور جس شخص سے اس کے اعمال کا پورا پورا حساب لیا گیا وہ ہرگز عذاب سے نہ بچے گا۔ معلوم ہوا کہ مومنین کے اعمال بھی رب العزت کے سامنے پیش تو سب ہوں گے، مگر ان کے ایمان کی برکت سے ان کے ہر عمل پر مناقشہ نہیں ہوگا، اسی کا نام ”حساب یسیر“ ہے۔

۴ وقراءة الكتاب: اعمال نامے کے پڑھنے پر ہم ایمان رکھتے ہیں، اعمال نامہ وہ لکھی ہوئی کتاب ہے، جس میں بندوں کی طاعات اور ان کے معاصی درج ہوں گے، اہل ایمان کا اعمال نامہ سامنے سے داہنے ہاتھ میں اور کفار کا پیچھے سے بائیں ہاتھ میں دیا جائیگا، جس کو وہ پڑھیں گے، جیسے ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿وَنُخْرِجُ لَهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ كِتَابًا مِّنْ سُورَاتِهِ اِقْرَأْ كِتَابَكَ كَفَىٰ بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ حَسِيبًا﴾ [بنی اسرائیل: ۱۴] یعنی قیامت کے دن اس انسان کا اعمال نامہ اس کے دیکھنے کے لئے نکال کر سامنے کر دیں گے جس کو وہ کھلا ہوا دیکھ لے گا اور اس سے کہا جائیگا کہ لے اپنا اعمال نامہ خود پڑھ لے آج تو خود ہی اپنا حساب جانچنے کے لئے کافی ہے، اصحاب یحییٰ بڑے سرور و انبساط سے اپنا اعمال نامہ پڑھیں گے، اور دوسروں کو کہیں گے ﴿هَؤُلَاءِ اَقْرَأُوا كِتَابِهِ﴾ [الحاقة: ۱۹] کہ آؤ میری کتاب پڑھ لو، باقی اصحاب شمال کو جب پیٹھ کے پیچھے سے بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ پکڑا جائے گا۔ ﴿فَسَوْفَ يَدْعُوا ثُبُورًا﴾ [انشقاق: ۱۱] عذاب کے ڈر سے پکارے گا موت۔ موت۔

والتواب والعقاب: ثواب اور عقاب پر ایمان رکھتے ہیں، الثواب والمثوبة: اعمال کا بدلہ، خیر ہو یا شر، عموماً خیر کے لئے مستعمل ہے۔ عَاقِبَةُ وَعِقَابًا، مُعَاقِبَةُ بِذَنْبِهِ وَعَلَىٰ ذَنْبِهِ “مواخذہ کرنا، سزا دینا اسم ”العقوبة“۔ اعمال خیر پر ثواب اور اعمال بد پر عقاب کے سلسلے میں قرآن و حدیث کی بہت سی آیات و احادیث وارد ہیں۔ والصراط: پل صراط پر بھی ہم ایمان رکھتے ہیں، جہنم کی پشت پر یہ ایک پل

ہوگا جس کے اوپر سے سب کو گزرتا ہوگا۔ کما قال تعالى: ﴿وإن منكم إلا وادها﴾ [مریم: ۷۱] صحیح اور رائج قول کے مطابق ”ورود“ سے مراد ”مرور علی الصراط“ ہے۔

قال ابو سعید الخدری الصحابیؓ: ”بلغني أن الجسر أدق من الشعر وأحد من السيف“ (رواه مسلم وهذا في حكم المرفوع) یعنی یہ پل بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز ہے، احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان میں سے بعض پل صراط پلک جھپکنے میں عبور کریں لیں گے اور بعض اہل ایمان اچکنے والی بجلی کے مانند اس پر گزر جائیں گے، بعض تیز ہوا کے مانند اس پر گزر جائیں گے، بعض تیز رفتار گھوڑے کی طرح گزریں گے اور بعض پرندوں کی رفتار سے عبور کریں گے۔ الغرض اہل ایمان حسب درجات اس کو عبور کر کے آگے جنت میں پہنچ جائیں گے اور جہنمی لوگ کٹ کر نیچے گر جائیں گے۔

والميزان: أي نؤمن بالميزان. ميزان سے مراد وہ شے ہے جس کے ذریعے اعمال تولے جائیں گے، جمہور کا مسلک یہ ہے کہ میزان ایک ہی ہے ”نضع الموازين“ میں اس کو بصیغہ جمع اس لئے تعبیر کر دیا ہے کہ وہ بہت سے موازن کا کام دے گی، قیامت تک سب کے اعمال کو یہی ترازو تولے گی، جمہور کے قول کے مطابق وزن اعمال کی صورت یہ ہوگی کہ عین اعمال کو وہاں جواہر مستقلہ (جسم) کی شکل دے دی جائے گی اور ان کا وزن کیا جائے گا یا اعمال اعراض ہونے کے باوجود تولے جائیں گے، کیونکہ بخار، موسم، گاڑی کی رفتار، بجلی، گیس اور زلزلہ وغیرہ اگر تولے اور ماپے جاسکتے ہیں تو اعمال کیونکر نہیں تولے جاسکتے؟۔

والجنة والنار مخلوقتان

جنت اور دوزخ اللہ کی مخلوق ہیں۔

جنت اور جہنم دونوں برحق ہیں دونوں کے ثبوت پر بے شمار آیات و احادیث ہیں، معتزلہ کا خیال تو یہ ہے کہ جنت اور جہنم ابھی موجود نہیں ہیں، بلکہ قیامت کے دن پیدا کی جائیں گے معتزلہ چونکہ عقل کے پجاری ہیں اس لئے وہ کہتے ہیں کہ جزاء سے پہلے جنت و جہنم کی تخلیق بلاوجہ ہے، کیونکہ اس طرح تو جنت اور جہنم ایک طویل عرصہ کے لئے معطل ہوں گی۔ لیکن اہل سنت کے نزدیک جنت اور جہنم پیدا کی جا چکی ہیں اور اس وقت بھی موجود ہیں، اس لئے کہ (۱) آدم اور حواء علیہما السلام کا قصہ قرآن میں موجود ہے اور دونوں کو جس جنت میں رہائش دی گئی تھی اس سے مراد یہی معروف جنت ہے۔ (۲) نصوص قرآنیہ میں جنت اور جہنم کے تیار کیے جانے کے بھینے ماضی خبر دی گئی ہے۔ جیسے ﴿أَعِدَّتْ لِلْمُتَّقِينَ﴾

[آل عمران: ۱۲۳]

﴿أَعِدَّتْ لِلَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ﴾ [الحید: ۲۱]

﴿أَعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ﴾ [آل عمران: ۱۳۱]

لَا تَفْنِيَانِ أَبَدًا وَلَا تَبِيدَانِ.

جنت اور دوزخ کبھی فنا نہیں ہوں گی نہ ہی ان پر ہلاکت آئے گی۔

(مقالات کوثری: ۲۷۶) پر ”مسألة الخلود“ کے عنوان کے تحت علامہ کوثریؒ

لکھتے ہیں: ”دوامُ نعيمِ أهل الجنة“ واستمرار عذاب أهل الجحيم مما علم من الدين بالضرورة وقد تواردت الأدلة على بقاء الجنة والنار، ومضت الأمة على هذه العقيدة مدى الدهور“ الغرض قرآن کریم کی متعدد آیات سے جنت کا ہمیشہ ہمیشہ باقی رہنا ثابت ہے۔ لیکن جہم بن صفوان جنت اور جہنم کے فناء کے قائل ہے، مگر صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کوئی بھی اس کا قائل نہیں، حدیث شریف میں ہے کہ جنت اور جہنم کی بیچ میں موت ذبح کر دی جائے گی اور کہا جائے گا۔ ”یا اهل الجنة خلود“ فلاموت، ویا اهل النار خلود فلا موت“

فإن الله تعالى خلق الجنة والنار قبل الخلق وخلق لهما أهلاً.
اللہ تعالیٰ نے جنت اور دوزخ کو دوسری مخلوق کو پیدا کرنے سے پہلے بنایا اور
ان کے لئے اہلیت رکھنے والے لوگ بنائے۔

دلیل اس دعویٰ کی یہ ہے جیسے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ
كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْإِنسِ﴾ [اعراف: ۱۷۹] اور ہم نے ایسے بہت سے جن اور انسان
دوزخ ہی میں رہنے کے لئے پیدا کئے ہیں۔ مسلم اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ ”إن
الله خلق للجنة أهلاً خلقهم وهم في أصلاب آبائهم وخلق للنار أهلاً،
خلقهم لها وهم في أصلاب آبائهم“ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کے لئے اہل پیدا
کیئے درآں حالیکہ وہ ابھی باپ کی پیٹھ میں تھے۔

فمن شاء منهم إلى الجنة أدخله فضلاً منه ومن شاء منهم إلى
النار أدخله عدلاً منه.
ان میں سے جسے چاہے گا اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل کرے گا اور
جسے چاہے گا اپنے عدل و انصاف کے ساتھ جہنم رسید کرے گا۔

اس کا حاصل یہ نکلا ”کل عطاء منه فضل و کل عقوبة منه عدل“ یعنی
اللہ کے ہاں ظلم نہیں اگر عطاء کرے تو یہ اس کا فضل ہے اور اگر عذاب میں مبتلا کرے تو یہ اس
کا عدل ہے۔

وكل يعمل لما قد فرغ له و صائر لما خلق له والخير والشر
مقدّارن على العباد.

ہر انسان وہی کام سرانجام دیتا ہے جس کے لئے اسے فراغت دی گئی اور ہر
شخص اسی طرف لوٹنے والا ہے، جس کے لئے اسے پیدا کیا گیا۔ خیر و شر کا بندوں
کے لئے فیصلہ کر دیا گیا ہے۔

ایک نسخے میں ”کل يعمل لما قد فرغ منه“ کے الفاظ ہیں جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ہر شخص عمل کر رہا ہے اس چیز کے لئے جس سے فراغت ہو چکی ہے۔ حاصل یہ کہ جس کے لئے جو مقدر ہے وہ ہو کر رہے گا۔

والاستطاعة التي بها الفعل، من نحو التوفيق الذي لا يوصف
المخلوق به تكون مع الفعل - وأما الاستطاعة مِنْ جِهَةِ الصَّحَةِ،
والوسع، والتمكين، وسَلَامَةِ الآلَاتِ، فَهِيَ قَبْلَ الْفِعْلِ، وَبِهَا يَتَعَلَّقُ
الخطاب وهو كما قال تعالى: ﴿لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا
وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶]

اور وہ استطاعت جس کی وجہ سے فعل واجب ہوتا ہے جیسے توفیق ہے، جس سے مخلوق کا اِتِّصاف جائز نہیں، تو یہ استطاعت، فعل کے ساتھ ہوتی ہے، اور رہی وہ استطاعت جو صحت، وسعت، قدرت اور آلات کی سلامتی کے اعتبار سے ہے۔ اس کا وجود فعل سے پہلے ہوتا ہے اور خطاب (حکم) اسی استطاعت سے متعلق ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ”اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔“

استطاعت دو طرح کی ہوتی ہے: ایک قدرت حقیقی، جو استطاعت کا حقیقی معنی ہے۔ دوم اسباب و آلات کا سالم ہونا اور اعضاء کا صحیح ہونا، جو استطاعت کا مجازی معنی ہے۔ (۱) قدرت حقیقیہ: قدرت حقیقیہ سے مراد، اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے یہ قدرت حقیقیہ فعل کا مقارن بالزمان ہے، پہلے سے بندہ کے اندر فعل کی قدرت نہیں ہوتی، بلکہ جب وہ فعل کا ارادہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس فعل کی قدرت پیدا فرمادیتے ہیں جس کے ساتھ ہی فعل موجود ہو جاتا ہے نیز قدرت حقیقیہ فعل کے لئے علت بھی ہوتی ہے۔ (۲) استطاعت بمعنی سلامت اسباب و آلات و صحت اعضاء: یہ فعل سے مقدم ہوتی ہے۔

والحاصل أن القدرة لها إطلاقان فتطلق تارة ويراد بها حقيقة القدرة وهي مع الفعل، وتطلق أخرى ويراد بها الوسع والسلامة وهي قبل الفعل. انسان کو مکلف کرنے کا مدار قدرتِ حقیقیہ پر نہیں ہوتا، بلکہ قدرت بمعنی سلامت اسباب پر ہوتا ہے (جس کی طرف آیت کریمہ میں اشارہ ہے) کیونکہ جو قدرت مدار تکلیف ہوتی ہے وہ فعل پر مقدم ہوتی ہے، لہذا استطاعت بمعنی سلامت اسباب ہی مدار تکلیف ہوگی۔

افعال العباد

وأفعال العباد هي بخلق الله تعالى وكسب من العباد.
بندوں کے افعال اور کام اللہ کی مخلوق اور بندوں کا کسب و کمائی ہیں۔

خلق اور کسب کا فرق

الخلق فعل الله وهو إحداث الاستطاعة في العبد واستعمال الاستطاعة المحدثه فعل العبد.

یعنی بندہ میں استطاعت اور عمل کی طاقت پیدا کرنا خلق ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ اور استطاعت حادثہ، یعنی اللہ نے بندہ کو عمل کرنے کی جو قوت اور قدرت عطا کی ہے اس قوت اور قدرت کو استعمال کرنا کسب ہے اور یہ بندہ کا فعل ہے۔

افعال عباد کی دو قسمیں ہیں (۱) افعال اضطراریہ: جو بندہ سے اس کے ارادہ و اختیار کے بغیر صادر ہوتے ہیں۔ جیسے ”العروق النابضة“ (دھڑکتی رگیں) درختوں کی حرکت اور حرکت مرتعش (اس شخص کی حرکت جیسے رعشہ کا عارضہ ہو) اس طرح کی افعال بالاتفاق اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہیں۔ (۲) افعال اختیاریہ: مثلاً کفر و ایمان، طاعت اور معصیت وغیرہ، یہی محل اختلاف ہیں، جبر یہ ان افعال کے بارے میں بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں اور معتزلہ کہتے ہیں کہ بندہ خود ان افعال کا موجد اور خالق ہے، اللہ تعالیٰ کی قدرت کو کوئی دخل نہیں اور اہل سنت والجماعت نہ تو جبر یہ کی طرح بندہ کا مجبور محض مانتے ہیں

کہ اس کی قدرت و اختیار کا کوئی دخل نہ ہو اور نہ معجزہ کی طرح اللہ تعالیٰ کو بالکل بے دخل مانتے ہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ: بندوں کے افعال اختیاریہ بندہ اور اللہ دونوں کی قدرت سے وجود میں آتے ہیں، بندہ کی قدرت کا تعلق کسب سے ہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت کا تعلق خلق سے ہے، یعنی بندہ کا سبب ہے اور اللہ خالق ہے، اہل سنت کی دلیل متعدد نصوص ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُونَ﴾ [الصافات: ۹۶] اللہ خالق ہے تمہارا اور تمہارے اعمال کا بھی۔ ماصدریہ ہے، ”ای واللہ خلقکم وعملکم“ دوسری جگہ فرمایا: ﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ فَاعْبُدُوْهُ﴾ [الانعام: ۱۰۲] جب اللہ تعالیٰ ہر شے کا خالق ہے اور افعال عباد بھی شے ہیں لہذا افعال عباد کا بھی خالق وہی ہوگا۔

ولم يكلفهم الله تعالى اِلَّا مَا يُطِيقُونَ.

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو انہیں کاموں کا حکم دیا ہے جن کی وہ طاقت رکھتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے بندہ کو ”مالایطاق“ (ایسے کام کا کرنا بندہ کی قدرت اور بس میں نہیں) کا مکلف نہیں بنایا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی طاقت کے بقدر مکلف بنایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿لَا يَكْلِفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا﴾ [البقرة: ۲۸۶]

اب یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک ہے تکلیف اور دوسری ہے تعجیز، دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ تکلیف میں آمر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شخص مامور سے فعل مامور بہ کا وجود ہو اور تعجیز میں آمر کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ شخص مامور سے فعل مامور بہ انجام نہ پاسکے، تاکہ اس کا عاجز ہونا ظاہر ہو جائے، جیسا کہ قیامت کے روز مصورین کو اپنی بنائی ہوئی صورتوں کو زندہ کرنے کا امر ”أَحْيُوا مَا خَلَقْتُمْ“ تعجیز کے لئے ہوگا۔

وَلَا يُطِيقُونَ اِلَّا مَا كَلَّفَهُمُ. وَهُوَ تَفْسِيرٌ لِّاِحْوَالٍ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ
نَقُولُ: لَا حِيلَةَ لِاَحَدٍ وَلَا حِرْكََةَ لِاَحَدٍ وَلَا تَحْوَلَ لِاَحَدٍ عَنْ مَعْصِيَةِ اللّٰهِ اِلَّا
بِمَعْنُوْنَةِ اللّٰهِ وَلَا قُوَّةَ لِاَحَدٍ عَلٰى اِقَامَةِ طَاعَةِ اللّٰهِ وَالثَّبَاتِ عَلَيْهِمَا اِلَّا
بِتَوْفِيقِ اللّٰهِ.

اور وہ طاقت نہیں رکھتے ہیں، مگر جس کے وہ مکلف ہیں ”لا حول ولا قوۃ“ کے مفہوم

کا حاصل بھی یہی ہے، ہم یہ اقرار کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے سوا اس کائنات میں کسی کا کوئی بس نہیں چلتا نہ کوئی چیز اس کے حکم کے بغیر حرکت کر سکتی ہے، اللہ تعالیٰ کی مدد کے بغیر نہ کوئی اس کی نافرمانی سے بچ سکتا ہے اور نہ اللہ کی اطاعت کے ادا کرنے پر کسی کو کوئی قوت ہے اور نہ طاعت پر ثابت قدم رہنے کی طاقت ہے، مگر اللہ کی توفیق سے۔

طاقت سے مراد، توفیق خداوندی ہے، اسباب و آلات کا سالم ہونا مراد نہیں ہے، یہاں امام طحاویؒ کی عبارت پر تھوڑا اشکال ہے، کیونکہ ان کی عبارت سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بندوں کو جن امور (امرونبی وغیرہ) کا مکلف بنایا ہے، بندے ان سے زیادہ کی طاقت نہیں رکھتے ہیں، حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ بندوں کو جن امور کا مکلف بنادیا گیا ہے وہ ان سے کہیں بڑھ کر زیادہ مشکل کی بھی طاقت رکھتے ہیں، مگر یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ اپنے بندوں کے ساتھ آسانی اور تخفیف کا ارادہ کرتے ہیں، سختی کا نہیں، اس لئے ان کو زیادہ مشکل کا مکلف نہیں بنایا، جیسے ارشاد ہے: ﴿يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ [البقرة: ۱۸۵]

”لاحول ولا قوة الا باللہ“ سے مصنف کی غرض اثباتِ قدر کی دلیل کو پیش کرنا ہے اور آگے پھر خود اس کی تشریح موجود ہے۔

وَكُلُّ شَيْءٍ يَجْرِي بِمَشِيئَةِ اللَّهِ تَعَالَى وَعِلْمُهُ وَقَضَائِهِ وَقُدْرُهُ، غَلَبَتْ مَشِيئَتُهُ الْمَشِيئَاتِ كُلَّهَا وَغَلَبَ قَضَاؤُهُ الْحِيلَ كُلَّهَا، يَفْعَلُ مَا يَشَاءُ وَهُوَ غَيْرُ ظَالِمٍ أَبَدًا” لَا يُسْأَلُ عَمَّا يَفْعَلُ وَهُمْ يُسْأَلُونَ“۔
کائنات کی ہر چیز اللہ تعالیٰ کی منشاء، اس کے علم اور قضاء و قدرت سے جاری ہے اس کی مشیت اور مرضی تمام مشیتوں پر غالب ہے اور اس کا فیصلہ تمام حیلوں اور تدبیروں پر غالب ہے جو وہ چاہتا ہے کرتا ہے وہ ذات کسی پر ظلم نہیں کرتی وہ جو کام کرتا ہے اس سے پوچھنا نہ جائے گا (اور جو یہ لوگ کرتے ہیں) ان سے پوچھا جائے گا۔

ارادہ اور مشیت دونوں کا ایک ہی معنی ہے اور ایک ہی صفت سے یہ دونوں

عبارت ہیں۔

قضاء کی دو قسمیں ہیں (۱) قضاء تکوینی: جیسے ارشاد ہے: ﴿فَقَضَاهُنَّ سَبْعَ سَمَوَاتٍ فِي يَوْمَيْنِ﴾ [فصلت: ۱۲] یعنی دودن میں اللہ نے آسمان بنائے۔ (۲) قضاء شرعی: جیسے ارشاد ہے: ﴿وَقَضَىٰ رَبُّكَ أَلَّا يَٰٓأَهْلَ الْاِسْرَاءِ﴾ [۲۳] یعنی حکم کر چکا تیرا رب کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو، یہاں قضاء سے قضاء تکوینی مراد ہے قضاء شرعی مراد نہیں۔

”وہو غیر ظالم ابداً“ یعنی اللہ تعالیٰ کبھی بھی کسی پر ظلم نہیں کرتا، قرآن کی بہت ساری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کو بندوں کے ظلم سے منزہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَظْلَمُ رَبُّكَ أَحَدًا﴾ [الکہف: ۴۹] ﴿وَمَا أَنَا بِظَالَمٍ لِّلْعَبِيدِ﴾ [ق: ۲۹] ﴿وَمَا ظَلَمْنَاهُمْ وَلٰكِن كَانُوا هُمُ الظَّالِمِينَ﴾ [الزخرف: ۷۶] حدیث قدسی ہے: ”یا عبادي، اني حرمتُ الظلم على نفسي وجعلته بينكم محرماً فلا تظالموا“

ایصال ثواب

وفي دُعاء الأحياء وصدقاتهم منفعة للميت.

اور مردوں کے واسطے زندوں کی دعاء میں اور مردوں کی طرف سے زندوں کے صدقہ و خیرات کرنے میں مردوں کو نفع ہوتا ہے۔

ایصال ثواب کا ثبوت بہت سی احادیث اور آثار سے ہے، شارح نے مردہ کے لئے زندوں کی دعاء اور ان کی طرف سے صدقہ خیرات، تلاوت یا تسبیح و تہلیل یا نفل نماز وغیرہ کے نفع بخش ہونے کی خبر دی ہے، لہذا اہل سنت والجماعت اصل ایصال ثواب میں متفق ہیں۔ عبادات بدنیہ میں اختلاف ہے۔ امام ابو حنیفہ، امام احمد اور جہور سلف و خلف رحمہم اللہ کے نزدیک بدنی عبادات کے ساتھ ساتھ مالی عبادات کا ثواب دوسرے مسلمان کو بخشنا

جائز ہے، البتہ ایصالِ ثواب کے لئے اجتماع کا اہتمام اور اس میں قیود و رسوم جیسے سوئم، جمعرات، چہلم، برسی نیز اہل میت کی طرف سے دعوت کرنا یہ سب امور بدعت اور ناجائز ہیں، ہاں ایصالِ ثواب قید و رسم کی پابندی سے ہٹ کر جب بھی کرے اور جس چیز کی بھی کرے تو وہ ثواب میت کو پہنچ جاتا ہے یعنی صدقہ، خیرات، دعا اور تلاوت قرآن مجید سب کا ثواب میت کو پہنچ سکتا ہے البتہ ایصالِ ثواب کے لئے اجرت پر قرآن پڑھوانا درست نہیں۔ (ایصالِ ثواب بصورت قرآن کے لئے دیکھئے) (شرح عقیدۃ الطحاویہ لابن ابی العز اور سورۃ نجم کی آیت کے تحت تفسیر مظہری) جمہور کے برعکس امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ صرف عبادات مالیہ میں وصولِ ثواب کے قائل ہیں۔ البتہ! معتزلہ وغیرہ مطلقاً ایصالِ ثواب کے منکر ہیں یہ حضرات قرآن کریم کی آیت: ﴿لَيْسَ لِلْإِنْسَانِ إِلَّا مَا سَعَى﴾ [سورہ نجم: ۳۹] سے یوں استدلال کرتے ہیں کہ قرآن تو نفع آخرت کو صرف اپنی ذاتی سعی میں منحصر بتلا رہا ہے۔ جس سے غیر کی سعی کے نافع ہونے کی نفی نکل رہی ہے، اس کا ایک جواب تو یہ ہے کہ آیت میں سعی ایمانی مراد ہے جو آخرت میں غیر کے کار نہیں ہو سکتی کہ ایمان تو کسی کا ہو اور نجات کسی کی ہو جائے باقی احادیث و آثار میں سعی عملی مراد ہے جو ایک کی دوسرے کے کام آسکتی ہے، چنانچہ حضرت حکیم الامت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ: ایمان کے بارے میں صرف اپنی کمائی ملے گی یعنی کسی کو دوسرے کا ایمان اس کے کام نہ آئے گا۔ کسی کو ایصالِ ثواب کرنا بھی تو انسان کی سعی ہے جب اس کا ایصال کردہ ثواب مردہ کو مل جائے تو ایصال کنندہ کو اپنی سعی مل گئی دوسرا جواب یہ ہے کہ صرف اپنے عمل کا فائدہ اللہ کا عدل ہے اور دوسرے کے عمل سے فائدہ اللہ کا فضل ہے۔ ایصالِ ثواب عقلاً بھی جائز ہے، کیونکہ ثواب دراصل بھلائی کرنے والے کا حق ہے، لیکن جب وہ اس ثواب کو اپنے کسی مسلمان بھائی کے لئے ہبہ کرتا ہے، تو اس سے کوئی مانع نہیں، جیسے زندگی میں اگر کسی مسلمان کو اپنا مال ہبہ کرنا چاہے یا اس کی موت کے بعد اپنے حق کو معاف کر کے میت کو بری الذمہ کرنا چاہے، تو اس کا بھی کوئی مانع نہیں۔

واللہ تعالیٰ يستجیب الدعوات ویقضي الحاجات .

اللہ تعالیٰ دعاؤں کو قبول اور حاجات کو پورا کرتا ہے۔

ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿ادعونی استجب لکم﴾ [الغافر: ۶] یہ آیت امت محمدیہ کا خاص اعزاز ہے کہ ان کو دعاء مانگنے کا حکم دیا گیا اور اس کی قبولیت کا وعدہ کیا گیا اور جو دعاء نہ مانگے، اس کے لئے عذاب کی وعید آئی ہے، چنانچہ سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت ہے: ”من لم یسأل اللہ یغضب علیہ“ جو دعاء نہیں مانگتا، اس سے اللہ ناراض ہوتے ہیں۔ وللہدر القائل

الرب یغضب ان ترک سئواله وبنی آدم حین یُسئل یغضب
مسلمان جو بھی دعاء اللہ سے کرتا ہے اللہ اس کو عطا فرماتا ہے، بشرطیکہ اس میں کسی گناہ یا قطع رحمی کی دعائ نہ ہو، اور قبول فرمانے کی تین صورتوں میں سے کوئی صورت ہوتی ہے، ایک یہ کہ جو مانگا وہی مل گیا دوسرے یہ کہ اس کی مطلوب چیز کے بدلے اس کو آخرت کا کوئی اجر و ثواب دے دیا گیا، تیسرے یہ کہ مانگی ہوئی چیز تو نہ ملی، مگر کوئی آفت و مصیبت اس پر آنے والی تھی وہ ٹل گئی۔ (مسند احمد)۔ کافر کی دعاء اگر دنیا سے متعلق ہو، تو قبول ہو سکتی ہے اور اگر آخرت سے متعلق ہو تو قبول نہ ہوگی۔

ویملک کل شیء ولا یملکہ شیء ولا ینعی عن اللہ طرفۃ عین
وَمَنِ اسْتَغْنَىٰ عَنِ اللّٰهِ طَرَفَةَ عَيْنٍ فَقَدْ کَفَرَ، وَصَارَ مِنْ اَهْلِ الْحَیْنِ .
اللہ تعالیٰ ہر چیز کا مالک ہے اس کا کوئی مالک نہیں اللہ تعالیٰ سے پلک جھپکنے کی
مقدار اور ایک لحظہ بھی کوئی بے نیاز نہیں ہو سکتا اور جو شخص لحظہ بھر بھی اللہ تعالیٰ سے
بے نیاز ہو گیا تو اس نے کفر کا ارتکاب کیا اور وہ ہلاکت زدہ لوگوں میں شمار ہو گیا۔

الحین: بالفتح: ہلاکت

وإن الله تعالى يغضب ويرضى لا كأحد من الورى.
اللہ تعالیٰ ناراض بھی ہوتا ہے اور خوش بھی لیکن اس کی ناراضی اور خوشی مخلوق جیسی نہیں ہوتی۔

”لا كأحد من الورى“ میں نفی تشبیہ ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کے لئے غضب، رضا، عداوت، محبت اور بغض جیسی صفات قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، مگر اللہ تعالیٰ کی صفات کو اپنی صفات پر قیاس کرنا سخت نادانی ہے، جہور سلف اس قسم کی صفات کی تشریح ہی سے توقف کرتے ہیں، کیونکہ ارشاد ہے: ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهِ شَیْءٌ﴾ مخلوقات کو اللہ سے کچھ بھی مشابہت نہیں۔ مثلاً جب کسی آدمی کو غیظ وغضب آتا ہے تو اس کے نتیجے میں غلیان دم القلب (قلب کے خون کے جوش مارنے) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے، جبکہ اللہ کی صفت میں غضب کا یہ نتیجہ ہرگز نہیں ہوتا ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کی ذات قلب اور دم سے منزہ ہے، بلکہ فرشتوں کے لئے بھی صفت غضب ثابت ہے، مگر وہ بھی انسان کے غضب کی کیفیت کے مماثل نہیں، کیونکہ عند الغضب قلب کے خون کے جوش مارنے کا تصور ان میں بھی نہیں۔

وَنَحِبُّ أَصْحَابَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ وَلَا نَفْرِطُ فِي حُبِّ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَلَا نَتَبَرَّأُ مِنْ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنُبْغِضُ مَنْ يُبْغِضُهُمْ وَبَغِيرَ الْخَيْرِ يَذْكُرُهُمْ وَلَا نَذْكُرُهُمْ إِلَّا بِخَيْرٍ. وَحُبُّهُمْ دِينٌ وَإِيمَانٌ وَإِحْسَانٌ وَبُغْضُهُمْ كُفْرٌ وَنِفَاقٌ وَطُغْيَانٌ.

ہم اصحاب رسول اللہ ﷺ سے محبت کرتے ہیں اور ہم (شیعوں کی طرح) ان میں سے کسی کی محبت میں اس کے حق سے زیادہ نہیں بڑھتے اور نہ ہی ان میں سے کسی سے برأت کا اظہار کرتے ہیں ہم اس سے بغض رکھتے ہیں، جو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے بغض رکھتا ہے اور (ہم اس سے بھی بغض رکھتے ہیں) جو ان کا اچھے انداز میں نام نہیں لیتا، ہم صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا ذکر خیر ہی کرتے ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت دین، ایمان اور احسان کی علامت ہے اور ان سے بغض کفر، نفاق اور سرکشی ہے۔

اس عبارت میں امام ابو جعفر طحاوی رحمۃ اللہ علیہ، روافض وغیرہ کی تردید کی طرف اشارہ کر رہے ہیں اور صحابہ کی عظمت بیان کر رہے ہیں۔ علامہ ابن حجرؒ نے ”الإصابة“ میں صحابی کی تعریف یوں کی ہے: ”وهو من لقي النبي صلى الله عليه وسلم مؤمناً به ومات على الإسلام“ یعنی صحابہ سے مراد وہ قدسی صفات ہستیاں ہیں، جنہوں نے بحالت ایمان، نبی ﷺ کی صحبت پائی اور تادم مرگ ایمان پر قائم رہے یہ ایسی بزرگ ہستیاں ہیں کہ انبیاء کے بعد کوئی بھی شخص خواہ کتنی ہی عبادت و ریاضت کر ڈالے ان کے مقام و مرتبہ کو نہیں پہنچ سکتا، تمام صحابہ کرام عادل، مؤمن اور جتنی ہیں۔ قال ملا علی القاری: ”الصحابة كلهم عدول مطلقاً لظواهر الكتاب والسنة وإجماع من يعتد به.“ (مرقاۃ: ۵/۵۱۷) بہر حال صحابہ کی عظمت و تقدیس ہمارا دین و ایمان ہے، قرآن و سنت اور دین کے نام سے جو کچھ بھی ہم تک پہنچا ہے وہ صحابہ ہی کے ذریعہ پہنچا ہے اگر کوئی اٹھ کر ان ستونوں کو گراتا ہے، تو جو کتاب و سنت ان کے ذریعہ ہم تک پہنچی اور ان پر دین کی عمارت کھڑی ہے یہ ساری منہدم ہو جائے گی۔ صحابہ کرام کی تعریف قرآن (کی سورۃ توبہ ۱۰۰:، سورۃ فتح ۲۹-۱۸، سورۃ انفال: ۷۲، سورۃ الحدید: ۱۰ اور الحشر: ۸-۱۰) میں اللہ تعالیٰ نے خود فرمائی ہے، جناب نبی کریم ﷺ نے کئی احادیث میں صحابہ کی شان کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو لوگ صحابہ کرام پر تنقید کی گنجائش نکالتے ہیں ان کے اندر سبائیت اور یہودیت کے جراثیم بول رہے ہیں اور بقول امام شعیبی وہ یہود و نصاریٰ سے بھی بدتر ہیں؟ کیونکہ جب یہود و نصاریٰ سے پوچھا گیا کہ تمہاری امت میں زیادہ بہتر کون لوگ ہیں؟ تو یہود نے کہا کہ موسیٰ علیہ السلام کے اصحاب اور نصاریٰ نے کہا کہ حواریین، یعنی عیسیٰ علیہ السلام کے صحابہ اور ایک یہ لوگ ہیں کہ اپنے رسول کے اصحاب کو بدترین امت ثابت کرنے میں لگے ہوئے ہیں۔

”ولا نتبرأ من أحد منهم: یعنی اہل سنت اعتدال کے راستے پر چلتے

ہوئے کسی بھی صحابی سے براءت کا اظہار نہیں کرتے، بلکہ تمام صحابہ بمعہ اہل بیت سے محبت کا اظہار کرتے ہیں، جبکہ روافض نے افراط سے کام لیا، چنانچہ ان کے ہاں اہل بیت کی محبت اس وقت تک کامل نہیں کہ جب تک ابو بکر، و عمر رضی اللہ عنہما سے براءت کا اظہار نہ کیا جائے، دوسری طرف خوارج نے تقریظ سے کام لیکر صحابہ کو ان کے درجے سے نیچے گرایا، چنانچہ انہوں نے حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما اور اہل بیت سے براءت ظاہر کی، مودودی صاحب نے بھی صحابہ کی شان میں گستاخی کی ہے۔ تفصیل کے لئے دیکھئے (تہذیبات طبع چہارم: ۲۹۴) اور ”خلافت و ملوکیت“ نامی کتاب میں تو بغض صحابہ ﷺ کے زہر کو علانیہ اُگل دیا ہے۔

و بغضہم کفر: یعنی صحابہ سے بغض کفر ہے، یہاں کفر سے کفر اصطلاحی مراد نہیں، بلکہ جیسے ﴿وَمَنْ لَّمْ يَحْكَمْ بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ﴾ میں کافر سے مراد عملی کافر ہے کہ ”ما أنزل الله“ کو عقیدۂ ثابت مان کر، پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے، تو اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے ایسے ہی یہاں مطلب یہ ہے کہ صحابہ سے بغض کرنا کافروں جیسا کام ہے۔

خلافت

وُنُبِئَتِ الْخِلَافَةُ بَعْدَ رَسُولِ اللَّهِ ﷺ أَوَّلًا لِأَبِي بَكْرٍ الصِّدِّيقِ ﷺ تَفْضِيلًا لَهُ وَتَقْدِيمًا عَلَى جَمِيعِ الْأُمَّةِ، ثُمَّ لِعُمَرَ بْنِ الْخَطَّابِ، ثُمَّ لِعُثْمَانَ بْنِ عَفَّانَ، ثُمَّ لِعَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ رَضْوَانِ اللَّهِ عَلَيْهِمْ أَجْمَعِينَ وَهُمْ الْخُلَفَاءُ الرَّاشِدُونَ وَالْأَئِمَّةُ الْمُهْتَدُونَ، الَّذِينَ قَضَوْا بِالْحَقِّ وَكَانُوا بِهِ يَعْدِلُونَ.

حضرت ابو بکر صدیق ﷺ کو ہم رسول اللہ ﷺ کا پہلا خلیفہ مانتے ہیں، اس لئے کہ وہ امت میں افضل ترین ہستی تھے، ان کے بعد درجہ بدرجہ حضرت عمر بن خطاب ﷺ کو دوسرا، حضرت عثمان بن عفان ﷺ کو تیسرا اور حضرت علی ابن ابی طالب ﷺ کو چوتھا، خلیفہ تسلیم کرتے ہیں اور یہ خلفاء راشدین ہیں اور ہدایت یافتہ امت کے امام ہیں۔

قرآن وحدیث کی روشنی میں اسلاف کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور ﷺ کے بعد عیسیٰ علیہ السلام (جو چوتھے آسمان پر زندہ موجود ہیں) کے علاوہ باقی تمام انسانوں سے افضل ابوبکر ﷺ ہیں، آپ رضی اللہ عنہ کا نام عبداللہ، لقب صدیق اور عتیق اور کنیت ابوبکر ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق ﷺ کو آنحضرت ﷺ نے اپنے مرض وفات میں اپنی جگہ پر امام نماز بنادیا تھا، آپ ﷺ کا ارشاد ہے۔

”مروا ابابکر فلیصلی بالناس“ (بخاری: ۶۶۴) اب یہ کھلا ہوا اشارہ ان کی خلافت کا تھا (اس آخری وقت کے علاوہ بھی جب کبھی آنحضرت ﷺ خود امامت نہ کر سکتے، تو حضرت صدیق ﷺ ہی کو امامت کا حکم دیتے)

تفصیل کے لئے: خلفاء راشدین: ۴۴، مولانا عبدالحکیم رکنی

نیز اس بیماری میں آپ ﷺ نے ان کے لئے خلافت نامہ لکھوانے کا کاغذ وغیرہ طلب فرمایا، مگر پھر کسی مصلحت سے اپنا ارادہ ترک کر دیا اور فرمایا: سوائے ابوبکر کے اور کسی کے لئے اللہ کی مشیت نہ ہوگی اور مسلمان بھی راضی نہ ہوں گے۔ (صحیح مسلم، رقم الحدیث: ۲۳۸۷) عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ ابوبکر صدیق ﷺ خلیفہ اول ہوں، کیونکہ جس ترتیب سے خلفاء راشدین دنیا سے کوچ کر گئے ہیں، اس ترتیب سے ان کو خلافت ملی ہے اور یہ طے ہے کہ سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق ﷺ انتقال کر گئے، اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ خلیفہ اول اور خلیفہ بلا فصل ہے۔

یہی وجہ ہے کہ پیغمبر پاک ﷺ کی وفات کے بعد حضور ﷺ کے دفن سے قبل انصار کے ایک قبیلہ بنو ساعدہ کے دالان اور برآمدہ میں مہاجرین و انصار سب کا اتفاق حضرت صدیق ﷺ پر ہو گیا اور موجودہ لوگوں نے ان کے دست حق پرست پر بیعت کر لی، بیعت کی ابتداء ایک انصاری سے ہوئی۔ (تاریخ الخلفاء)

اگر حضرت ابوبکر ﷺ مستحق خلافت نہ ہوتے تو صحابہ ان کی خلافت پر اجماع نہ کرتے، کیونکہ از روئے حدیث یہ امت کبھی باطل پر اجماع نہ کرے گی۔

حضرت علی المرتضیٰ ؑ کے متعلق بعض روایات میں ہے کہ انہوں نے بلا توقف ابتدا ہی میں حضرت ابوبکر ؓ سے بیعت کر لی تھی۔ (فتح الباری: ۳۷۹/۷) میں ہے ”وقد صحح ابن حبان وغيره من المحدثين حديث أبي سعيد الخدري أن عليا بايع أبا بكر في أول الأمر“ اور صحیح بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چھ مہینے کے بعد حضرت علی ؑ نے بیعت کی تھی، ممکن ہے کہ انہوں نے دومرتبہ بیعت کی ہو، پہلی بیعت مجمع عام میں نہ ہوئی ہو، اس لئے عام لوگوں کو غلط فہمی سے بچانے کے لئے چھ مہینے کے بعد مجمع میں بیعت کی۔ حضرت علی المرتضیٰ ؑ کا یہ قول: ”خير الأمة بعد نبينا أبو بكر ثم عمر“ بھی کتب احادیث میں موجود ہے۔

خليفة اول سيدنا حضرت صدیق اکبر ؓ نے ۱۱ لاکھ مربع میل پر، ۲۰ رسال ۳۰ ماہ ۹ دن خلافت کر کے، تریسٹھ برس کی عمر میں ۲۲ رجمادی الاخریٰ ۱۳ھ بروز ہفتہ برطانیق ۲۳ ر اگست ۶۳۲ء کو مغرب وعشاء کے درمیان اس دار فانی سے رحلت کی۔ اللہ کے پیارے رسول ﷺ کے پہلے مبارک میں دفن ہوئے یار غار اور مزار کا لقب پایا۔ حضرت صدیق اکبر ؓ نے رحلت سے قبل حضرت عثمان ؓ کو بلایا اور ان سے ابو حفص، حضرت عمر فاروق بن خطاب ؓ کی خلافت کے سلسلے میں اپنا عہد نامہ لکھ کر اس صحیفہ کو مہر بند کیا اور لوگوں کے سامنے اس کو پیش کیا اور انہیں اس شخص کے لئے بیعت کرنے کا حکم دیا جو صحیفہ میں ہو، تو صحابہ نے بیعت کی حتیٰ کہ حضرت علی ؑ کے پاس پہنچا انہوں نے فرمایا: ”بايعنا لمن فيها وان كان عمر.“ ہم نے اس شخص کی بیعت کی جو اس میں ہے اگرچہ وہ عمر ؓ ہی کیوں نہ ہوں۔ اس طرح حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت پر اتفاق ہو گیا سب سے پہلے عمر ؓ کو امیر المؤمنین کا لقب دیا گیا۔ خلیفہ ثانی سیدنا عمر فاروق نے ۲۲ لاکھ مربع میل پر ۱۰ سال ۵ ماہ ۴ دن خلافت کر کے ۲۶ ر ذوالحجہ ۲۳ھ فجر کے وقت حالت امامت میں ابو لؤلؤ فیروز مجوسی ایرانی کے حملے سے زخمی ہوئے اور تریسٹھ برس کی عمر یکم محرم ۲۴ھ کو انتقال

فرمایا۔ شہادت کے مرتبہ پر فائز ہو کر پہلے نبوت میں دفن ہوئے۔

حضرت عمر فاروق ؓ نے زخمی حالت میں مسئلہ خلافت کو چھ حضرات کی کمیٹی عثمان، علی، عبدالرحمن بن عوف، طلحہ، زبیر اور سعد بن ابی وقاص رضوان اللہ علیہم کے باہمی مشورہ پر چھوڑ گئے، پھر ان میں سے پانچ نے معاملہ عبدالرحمن بن عوف کے سپرد کر دیا اور ان کے فیصلے پر رضا مندی ظاہر کر دی، تو انہوں نے ابو عبداللہ حضرت عثمان بن عفان ذوالنورین ؓ کو منتخب کیا اور صحابہ کی ایک مجلس میں ان سے بیعت کی، پھر دوسرے لوگوں نے ان سے بیعت کی اس طرح سے حضرت عثمان غنی ؓ کی خلافت پر اجماع ہو گیا۔ خلیفہ ثالث سیدنا عثمان ؓ نے ۲۳ لاکھ مربع میل پر ۱۲ رسال ۱۱ ایوم خلیفہ رہے۔ ۸۲ برس کی عمر میں ۱۸ ذوالحجہ ۳۵ء کو ایک سازش کے تحت انتہائی مظلومیت کی حالت میں اسود التجیبی کے ہاتھوں شہید ہو کر جنت البقیع میں مدفون ہوئے۔

حضرت عثمان غنی ؓ تو شہید ہو گئے، مگر خلیفہ کا معاملہ بغیر طے کئے لوگوں پر چھوڑ گئے، تو بڑے بڑے مہاجرین و انصار نے حضرت علی ؓ پر اتفاق کیا اور ان سے منصب خلافت قبول کرنے کی درخواست کی اور ان سے بیعت کی، کیونکہ وہ اپنے ہم عصروں میں افضل اور خلافت کے زیادہ حقدار تھے۔ آپ ؓ کا نام علی، نقب اسد اللہ اور مرتضیٰ اور کنیت ابوالحسن اور ابوتراب ہے۔ خلیفہ رابع سیدنا علی المرتضیٰ ؓ ۴ رسال ۹ ماہ خلافت کرنے کے بعد ۲۱ رمضان المبارک ۴۰ھ میں عبدالرحمان ابن ملجم کے ہاتھوں فجر کے وقت جامع مسجد کوفہ میں داخل ہوتے ہی شہید ہوئے۔

عشرہ مبشرہ

وَأَنَّ الْعَشْرَةَ الَّذِينَ سَمَّاهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَبَشَّرَهُم بِالْجَنَّةِ
نَشْهَدُ لَهُمْ بِالْجَنَّةِ عَلَى مَا شَهِدَ لَهُمْ رَسُولُ اللَّهِ ﷺ وَقَوْلُهُ الْحَقُّ،
وَهُمْ: أَبُو بَكْرٍ، وَعُمَرُ، وَعُثْمَانُ، وَعَلِيٌّ وَطَلْحَةُ، وَالزُّبَيْرُ. وَسَعْدُ،
وَسَعِيدُ عَبْدِ الرَّحْمَنِ بْنِ عَوْفٍ، وَأَبُو عُبَيْدَةَ بْنُ الْجَرَّاحِ، وَهُوَ أَمِينُ
هَذِهِ الْأُمَّةِ ﷺ.

وہ دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کا رسول اللہ ﷺ نے نام لیا اور
انہیں جنت کی خوشخبری دی، ہم ان کے جنتی ہونے کی گواہی اس بناء پر دیتے ہیں کہ
حضور ﷺ نے اس کی گواہی دی آپ کا فرمان برحق ہے اور وہ دس صحابہ کرام یہ
ہیں، ابو بکر و عمر و عثمان و علی و طلحہ، زبیر، سعد، سعید، عبد الرحمن بن عوف، رضوان اللہ
تعالیٰ علیہم اور ابو عبیدہ بن الجراح ﷺ جو اس امت کے امین ہیں۔

خلاصہ یہ کہ جن دس صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے جنتی ہونے کی
بشارت مشہور ہے، ان میں خلفاء راشدین کے علاوہ چھ مزید صحابہ کرام طلحہ، زبیر، سعد،
سعید، عبد الرحمن بن عوف اور ابو عبیدہ بن الجراح رضوان اللہ علیہم بھی شامل ہیں، یہ دس
تو ”عشرہ مبشرہ“ کے نام سے مشہور ہیں، مگر ان کے علاوہ بھی صحابہ کی بعض جماعتوں مثلاً
اصحاب بدر اور اصحاب بیعت رضوان کے بارے میں اور بعض افراد مثلاً حضرت فاطمہ،
حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت بلال، حضرت سعد بن معاذ اور حضرت سلمان
فارس رضوان اللہ علیہم اجمعین وغیرہ کے بارے میں بھی جنت کی بشارت احادیث صحیحہ
میں وارد ہے، لیکن چونکہ مذکورہ دس حضرات کے جنتی ہونے کی بشارت ایک ہی
حدیث۔ (ترمذی اور ابوداؤد میں) میں وارد ہے اس بناء پر ان کے جنتی ہونے کی
بشارت مشہور ہو گئی اور وہ عشرہ مبشرہ کہلائے۔

ومن أحسن القول في أصحاب النبي ﷺ وأزواجه الطاهرات
من كل دَنَسٍ وذُرِّيَّاتِهِ الْمُقَدَّسِينَ من كل رِجْسٍ. فقد برئ من
النفاق.

جس نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم، ازواج مطہرات جو ہر عیب سے پاک
ہیں اور آپ ﷺ کی اولاد، جو ہر قسم کی خباثت سے پاک ہیں، کے متعلق اچھا تذکرہ
کیا جو برائی سے خالی ہو، وہ نفاق سے بری ہوا۔

روافض، صحابہ اور ازواج مطہرات کی شان میں گستاخیاں کرتے ہیں، جبکہ
اہل سنت کی شان یہ ہے کہ وہ صحابہ کرام، ازواج مطہرات کے علاوہ حضرت فاطمہؓ، علیؓ،
حسن اور حسین رضوان اللہ علیہم سب کی عقیدت و محبت کے قائل ہیں۔ ایں خانہ ہمہ
آفتاب است، امام محمد اوی نے یہ جو فرمایا: ”فقد برئ من النفاق“ اس میں اشارہ
ہے اس بات کی طرف کہ روافض و شیعیت کا بانی ایک منافق اور زندیق شخص عبد اللہ بن
سبأ تھا جو اپنے مکروفریب سے اسلام کا چہرہ مسخ کرنا چاہتا تھا، اس لئے بغض صحابہ
اور بغض ازواج مطہرات نفاق کی علامت ہے۔ جو سب کا تذکرہ بھلائی کے ساتھ
کرے گا نفاق سے بری ہوگا۔

وعلماء السلف من الصالحين والتابعين ومن بعدهم من أهل
الخير والأثر، وأهل الفقه والنظر لا يُدْكِرُونَ إلا بالجميل ومن
ذكرهم بسوء فهو على غير السبيل.

علماء سلف صالحین اور تابعین اور جو لوگ ان کے بعد ہوئے، جن کا تعلق اہل
خیر و محدثین سے یافتہ و نظر سے ہو، ہم ان کا ذکر جمیل ہی کرتے ہیں جو ان کا برائی
سے ذکر کرے وہ سیدھی راہ پر نہیں۔

علامت قیامت میں سے ایک بات یہ ہے کہ ”والعن آخر هذه الأمة أولها“

(ترمذی: ۴۴۴۳)

اس امت کے پچھلے لوگ اگلے لوگوں پر لعن طعن کریں گے۔ اس دور پر فتن میں جہاں حضور ﷺ کی ذکر کردہ دوسری علامات کا ظہور ہو رہا ہے، وہیں اس علامت کا بھی پوری طرح ظہور ہو رہا ہے۔ امام طحاویؒ کی غرض یہ ہے کہ تمام ائمہ سلف کے ساتھ نیک گمان رکھا جائے، دل سے ان کا احترام کیا جائے اور سمجھا جائے کہ ان میں سے ہر ایک نے کتاب و سنت اور صحابہ کرام کے طرز عمل کا مطالعہ اور اس میں غور و فکر کے بعد جو کچھ اپنے نزدیک زیادہ رائج سمجھا ہے، نیک نیتی سے اس کو اختیار کر لیا ہے ان میں سے کوئی بھی باطل پر نہیں۔

وَلَا نُفَضِّلُ أَحَدًا مِنَ الْأَوْلِيَاءِ عَلَى أَحَدٍ مِنَ الْأَنْبِيَاءِ عَلَيْهِمُ
السَّلَامُ وَنَقُولُ: نَبِيُّ وَاحِدٌ أَفْضَلُ مِنْ جَمِيعِ الْأَوْلِيَاءِ.
ہم کسی بھی ولی کو کسی نبی پر فضیلت نہیں دیتے، ہمارا یہ عقیدہ ہے، کہ ایک نبی
تمام اولیاء سے افضل ہے۔

اہل سنت والجماعت کا عقیدہ ہے کہ کوئی بھی امتی خواہ کتنی ہی عبادت و ریاضت کر ڈالے، انبیاء کے مرتبہ اور مقام کو نہیں پہنچ سکتا۔

بعض کرامیہ نے کہا ہے کہ ”الولاية افضل من النبوة“ اور ان میں سے بعض کا مقولہ ہے کہ ”اولیاء کی ابتداء انبیاء کی انتہاء ہے، مگر یہ باتیں حقیقت سے بہت دور ہیں، حقیقت بالکل اس کے برعکس ہے، یعنی انبیاء کی جہاں سے ابتداء ہوتی ہے وہ اولیاء کی انتہاء ہے، بقول شیخ مجدد الف ثانیؒ کے کہ: ”کمالات ولایت، کمالات نبوت کے مقابلہ میں وہی نسبت رکھتے ہیں جو قطرہ کو سمندر کے ساتھ ہے“، حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیریؒ (۶۲۱-۷۸۶ھ) نے تو یہاں تک لکھا کہ: انبیاء کی ایک سانس اولیاء کی پوری زندگی سے افضل ہے۔ ولی کی ولایت اتباع رسول پر موقوف ہے۔ اتباع رسول کی وجہ سے ولی کو ولایت حاصل ہے (ولی کی کرامت نبی کا معجزہ ہے، بیان القرآن ۷۸: ۷۶) علامہ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں: ”و کرامات اولیاء اللہ إنما حصلت ببركة اتباع رسولہ صلی

اللہ علیہ وسلم فهي في الحقيقة تدخل في معجزات الرسول صلى الله عليه وسلم“ (فتاویٰ ابن تیمیہ: ۱۱/۲۷) اس کے علاوہ بات یہ ہے کہ نبوت ایک وہی مقام ہے، جبکہ ولایت کسبی ہے، بہر حال مقام نبوت ولایت سے افضل ہے، واضح رہے کہ ہر نبی ولی ہوتا ہے، مگر ہر ولی نبی نہیں ہوتا گویا نبی میں نبوت بھی ہے، ولایت بھی ہے، مگر ولی میں صرف ولایت ہے وہ بھی نبی کی ولایت سے کم۔

نوٹ: انبیاء معصوم اور اولیاء محفوظ ہیں۔ معصوم وہ ہے کہ اس سے باوجود استعداد گناہ، گناہ سرزد ہونا محال ہو اور محفوظ وہ ہے کہ گناہ اس سے ممکن ہو، اگرچہ واقع نہ ہو، پہلی صورت مستزم محال ہے، دوسری ممکن، غیر واقع ہے۔ (ازار شادات شاہ عبدالعزیز رحمہ اللہ)

وَتَوْمَنُ بِمَا جَاءَ مِنْ كَرَامَاتِهِمْ وَصَحَّ عَنْ الثِّقَاتِ مِنْ رَوَايَتِهِمْ.
ہم اولیاء کرام کی کرامات کو مانتے ہیں اور ان کی روایت کو بھی مانتے ہیں، جو ثقات اور معتبر لوگوں سے صحیح طریقے سے ثابت ہوتی ہیں۔

معجزہ اور کرامت کا فرق

جو خرق عادت مکذبین نبوت کے الزام اور تعجیز کے لئے نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو، وہ معجزہ ہے اور اگر اس خرق عادت سے مقصود محض تشریف اور تکریم ہو، تو وہ کرامت ہے خواہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہو یا ولی کے، لہذا معجزہ نبی کے ساتھ مخصوص ہے اور کرامت عام ہے (نسیم الریاض شرح شفاء قاضی عیاض ”باب الرابع“ (بحوالہ علم الکلام: ۲۸۱) ایک فرق معجزہ اور کرامت میں یہ ہے کہ معجزہ کا اظہار ضروری ہے بخلاف کرامت کے کہ اس کا اخفاء ضروری ہے۔ إلا عن ضرورة (البیواقیت والجواهر) خواجہ نظام الدین اولیاءؒ کا ملفوظ ہے: ”فرض الله تعالى على أولياءه كتمان الكرامة كما فرض على أنبيائه إظهار المعجزة.“ (مجلس، ۱۱: ۵۸۸) واضح رہے کہ کرامت اور معجزہ میں اسباب طبع کا کوئی دخل نہیں ہوتا، بلکہ وہ براہ راست حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے، معجزہ اور

کرامت دونوں، نبی اور ولی کے اختیار میں بھی نہیں ہوتے، بلکہ جب اللہ تعالیٰ چاہتے ہیں تو معجزہ بھی کے ہاتھوں اور کرامت ولی کے ہاتھوں ظاہر فرمادیتے ہیں۔

اقسام خارق عادت

جو چیزیں خارق عادت ہوں ان کا صدور نبی سے ہوگا یا غیر نبی سے، اگر نبی سے ہے تو دعویٰ نبوت سے پہلے ہوگا یا بعد میں ہوگا، اگر دعویٰ نبوت سے پہلے ہے تو اس کو ”ارہصاص“ کہتے ہیں، اگر ان خارق عادت چیزوں کا صدور دعویٰ نبوت کے بعد ہو تو وہ ”معجزہ“ ہے اور اگر خارق عادت کا صدور غیر نبی سے ہو، تو ولی سے ہوگا یا غیر ولی سے ہوگا، اگر ولی سے ہو تو اس کو ”کرامت“ کہتے ہیں، اگر غیر ولی سے ہوگا تو عام مؤمن (کہ جس کا صالح و فاسق ہونا معلوم نہ ہو) سے ہوگا یا کافرو فاسق سے ہوگا اگر عام مؤمن سے ہو تو اس کو ”معونت“ کہتے ہیں، اگر کافرو فاسق سے ہو تو اس کو ”استدراج“ کہتے ہیں، اور اگر کوئی خرق عادت مدعی نبوت کے مقصد اور مطلب کے بالکل خلاف ظاہر ہو۔ (جیسے سیلہ کذاب نے ایک کانے شخص کی آنکھ پر تھوک لگایا تاکہ یہ آنکھ درست ہو جائے، لیکن قضاء الہی سے دوسری آنکھ بھی نابینا ہوگئی) تو اس کو ”اھانت“ اور ”خذلان“ کہتے ہیں یعنی اللہ کی طرف سے یہ رسوائی ہے۔

معتزلہ نے کرامت کا انکار اس لئے کیا ہے کہ: اگر اولیاء سے کرامت ظاہر ہو جائے تو کرامت کے معجزہ ہونے کا شبہ ہوگا، کیونکہ دونوں امر، خارق العادت ہیں، ایسی صورت میں، غیر نبی کو لوگ نبی سمجھ بیٹھیں گے، لیکن معتزلہ کی یہ بات غلط ہے، کیونکہ کرامت جس شخص کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے وہ مدعی نبوت نہیں ہوتا، برخلاف معجزہ کے، کہ وہ مدعی نبوت کے ہاتھ پر ظاہر ہونے والا خارق عادت امر ہے، اس لئے کرامت کے معجزہ ہونے کا شبہ نہیں ہو سکتا، حضرت مریم علیہا السلام کی کرامت کا ذکر قرآن کریم میں ہے اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے خط سے دریا نیل کا جاری ہو جانا اور ”نہاوند“ میں اپنے لشکر دیکھ کر یا ساریۃ الجبل کہنا اور ان لوگوں کا سن لینا تواریخ میں تو اتر کے ساتھ

منقول ہیں۔

فائدہ: حضرت اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں: ”اگر اتباع سنت نہیں تو کچھ بھی نہیں چاہیے ہوا پر اثر تا ہو یا پانی پر چلتا ہو۔ (ملفوظات)

علامات قیامت

ونؤمن بأشراط الساعة منها: خروج الدجال ونزول عيسى عليه السلام من السماء ونؤمن بطلوع الشمس من مغربها وخروج دابة الأرض من موضعها.

ہم علامات قیامت پر ایمان و یقین رکھتے ہیں، مثلاً دجال کا خروج عیسیٰ بن مریم علیہا السلام کا آسمان سے نازل ہونا سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، ”دابة الارض“ کا اپنی جگہ سے نکلنا۔

اللہ کے رسول ﷺ نے جن علامات قیامت کی خبر دی ہے ان علامات قیامت پر ایمان لانا واجب ہے۔ ان علامات قیامت کی تفصیل اور توضیح سیر، تاریخ اور حدیث و تفسیر کی کتابوں میں موجود ہے۔ وقد أفرد الناس أحاديث أشراط الساعة في مصنفات مشهورة.

قیامت کی علامات صغریٰ میں ہیں جن کا ذکر مختلف احادیث میں ہے اور علامات کبریٰ بارہ یعنی ظہور مہدی علیہ السلام، خروج دجال، نزول عیسیٰ علیہ السلام، یا جوج ماجوج، دھویں کا ظاہر ہونا، زمین کا دھنس جانا، سورج کا مغرب سے طلوع ہونا، صفاء پہاڑ سے جانور کا نکلنا، ٹھنڈی ہوا کا چلنا اور تمام مسلمانوں کا وفات پا جانا، حبشیوں کی حکومت اور بیت اللہ کا شہید ہونا، آگ کا لوگوں کو ملک شام کی طرف ہانکنا، صور پھونکا جانا اور قیامت کا قائم ہونا۔ یہاں امام طحاویؒ نے علامات کبریٰ میں سے خاص کر چار کا تذکرہ کیا ہے۔

اب یہاں چند امور کی وضاحت ضروری ہے (۱) دجال یہودی قوم کا ہے جس کا لقب مسیح ہے۔ فتنوں کے زمانہ میں جو کچھ دجال سے احیاء و امات اور خوارق کا ظہور ہوگا یہ ظہور

موجب التباس اور اشتباہ نہیں، کیونکہ بخاری میں ہے: ”وأن المسيح الدجال أعورُ عينِ اليمنى“ مسیح دجال کی دائیں آنکھ کافی ہوگی، جبکہ اللہ تعالیٰ کا نام نہیں۔ (بخاری: ۱۰۵۵۲)

ایسے ہی دجال کے بارے میں صحیح مسلم کی حدیث ہے: ”مکتوب بین عینینہ کافر، یقرأه مؤمن کاتب و غیر کاتب“ دجال کی پیشانی پر کافر لکھا ہوا ہوگا، جس کو ہر مؤمن پڑھے گا خواہ پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ ہو۔ (۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام دمشق کی جامع مسجد کے مشرقی جانب کے سفید رنگ کے پینار پر نازل ہوں گے، نزول کے بعد ۴۰ یا ۴۵ سال قیام کریں گے۔ باب ”لُد“ (جو کہ آج کل اسرائیلیوں کا ایئر پورٹ ہے) پر دجال کو قتل کریں گے۔ دیگر تفصیل احادیث میں ہیں۔ اب قادیانی مسلمانوں کو دھوکہ دینے کے لئے ایک اعتراض پیش کرتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اترنے کے بعد منصب نبوت پر فائز ہوں گے یا نہیں؟ اگر وہ بحیثیت نبی آجائیں گے، تو ختم نبوت پر زبرد پڑتی ہے، اگر نبی نہیں ہوں گے، تو ایک نبی کا نبوت سے معزول ہونا لازم آتا ہے، اس کا جواب یہ ہے کہ آپ ﷺ کے خاتم الانبیاء ہونے کا معنی یہ ہے کہ آپ ﷺ کے بعد کسی کو جدید منصب نبوت پر فائز نہیں کیا جائے گا، ختم نبوت کا معنی عطاء نبوت کی بندش ہے جس پر مہر لگ گئی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام تو آپ کی آمد سے صدیوں پہلے منصب نبوت پر فائز ہو چکے ہیں، اب کہ مرتبہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام تشریف لائیں گے تو آپ کی نبوت موقوف ہوگی، سلب نہ ہوگی، یعنی آپ نبوت سے معزول نہیں ہوں گے لیکن امت محمدیہ میں ان کی نبوت کا قانون نافذ نہیں ہوگا، صرف حضور ﷺ ہی کا نافذ ہوگا اور قانون محمدی پر عمل کرنے کی وجہ سے آپ حضور ﷺ کے امتی کی حیثیت سے ہوں گے، مگر مسلوب النبوت ہو کر ایک عام خالص امتی کی طرح ہرگز نہیں ہوں گے۔ جیسے ایک شخص ملک پاکستان کا صدر ہے وہ سعودی عرب کے سرکاری دورے پر جاتا ہے، اب ظاہر ہے کہ وہ ذاتی صدارت کے منصب سے معزول نہیں ہوا، لیکن سعودی عرب جا کر اس کا حکم بھی نہیں چلے گا، وہاں پر حکم سعودی عرب کے بادشاہ کا

چلے گا اسی طرح حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مثال سمجھیں۔ (۳) ”دابة الأرض“ ایک عجیب الخلق جانور ہوگا یہ عام جانوروں کی طرح تو الد و تاسل کے طریق پر پیدا نہیں ہوگا، بلکہ اچانک زمین سے نکلے گا۔ اس کا خروج مکہ مکرمہ میں ہوگا (شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ: ”صفا پہاڑ مکہ کا پھٹے گا اس میں سے ایک جانور نکلے گا) پھر ساری دنیا میں پھرے گا یہ کافر و مؤمن کو پہنچانے گا اور ان سے کلام کرے گا ہر کافر کے چہرے پر کفر کا نشان لگا دیگا۔ (معارف القرآن: ۶/۲۰۵)

وَلَا نَصْلِقُ كَاهِنًا وَلَا عَرَّافًا، وَلَا مَنْ يَدَّعِي شَيْئًا يُخَالِفُ الْكِتَابَ وَالسُّنَّةَ وَاجْمَاعَ الْأُمَّةِ.

ہم کسی کا ہن نجوی کو سچا اور صادق نہیں سمجھتے اور نہ ہی اسے سچا مانتے ہیں جو کتاب و سنت اور اجماع کے خلاف کوئی دعویٰ کرے۔

کاهن: من یخبر عن المغیبات. عَرَّاف: نجوی. وقیل: العَرَّاف یخبر عن الماضي والكاهن یخبر عن الماضي والمستقبل (المصباح)

مسند احمد میں ابو ہریرہؓ کی روایت ہے: ”من أتى عَرَّافًا أو كَاهِنًا، فصدقه بما يقول فقد كفر بما أنزل على محمد ﷺ“ جو شخص کسی کا ہن (غیب دانی کا مدعی، یا نجوی) کے پاس آئے اور اس کی کہی ہوئی بات کو سچ جانے تو اس نے اس کتاب کا انکار کیا جو اللہ نے محمد ﷺ پر نازل کی۔

مسلم کی حدیث ہے: ”مَنْ أَتَى عَرَّافًا فَسَأَلَهُ عَنْ شَيْءٍ لَمْ تُقْبَلْ لَهُ صَلَاةُ أَرْبَعِينَ لَيْلَةً“

بہر حال علم نجوم کوئی یقینی علم نہیں، بلکہ محض تخمین پر مبنی ہے اور کہانت بھی اسی طرح ہے، لہذا ان علوم سے حاصل شدہ توہمات پر یقین کرنا ہرگز جائز نہیں، خصوصاً کسی شخص کو مجرم قرار دینے کے لئے قطعاً حجت نہیں، عملیات کے ذریعہ کسی کو واقعاً چور سمجھنا جائز نہیں۔

وَنَرَى الْجَمَاعَةَ حَقًّا وَصَوَابًا وَالْفُرْقَةَ زَيغًا وَعَذَابًا.
ہم جماعت کو حق اور درست سمجھتے ہیں اور فرقہ بندی کو کج روی اور عذاب گردانتے ہیں۔

”جماعت“ کے بارے میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے پوچھا: ”مَنْ هِيَ يَا رَسُولَ اللَّهِ؟“ قال: ”مَأَانَا عَلَيْهِ وَأَصْحَابِي“ معلوم ہوا کہ اہل سنت والجماعت فرقہ ناجیہ ہے، اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر باقی فرق مبتدعہ ضالہ جادہ حق سے منحرف ہو کر فرقہ بندی اور افتراق کے شکار ہیں۔

واضح رہے کہ اجتہادی اختلاف، بشرطیکہ اصول اجتہاد کے مطابق ہو، وہ ہرگز تفرقہ نہیں، صحابہ و تابعین اور ائمہ فقہاء کا اختلاف اسی قسم کا اختلاف تھا۔ تفریق وہ مذموم ہے جو اصول دین میں ہو یا فروع میں نفسانیت کے غلبہ کی وجہ سے ہو، بایں معنی کہ فروعی بحثوں کو اصل دین قرار دیا جائے اور ان میں اختلاف کو جنگ و جدل اور سب و شتم کا ذریعہ بنا لیا جائے، قرآن و حدیث میں جہاں بھی تفرقہ کی مذمت ہے وہ وہی تفرقہ و اختلاف ہے، جو بینہ (پوری وضاحت) کے بعد کیا جائے۔

یاد رکھئے مفسرین، محدثین، فقہاء (مذہب اربعہ) اور حق پرست صوفیاء کرام، سب اہل سنت والجماعت ہیں، علماء دیوبند اہل سنت والجماعت سے ہٹ کر کوئی جدید گروہ اور فرقہ قطعاً نہیں، بلکہ اسی سوادِ اعظم اور فرقہ ناجیہ کا ایک حصہ ہے، دارالعلوم دیوبند مرکز کی طرف انتساب کی وجہ سے ان کا نام ”علماء دیوبند“ پڑ گیا۔ جو درحقیقت اس دور میں اہل سنت والجماعت اور سوادِ اعظم کی ایک تعبیر ہے۔

وَدِينُ اللَّهِ فِي الْأَرْضِ وَالسَّمَاءِ وَاحِدٌ وَهُوَ دِينُ الْإِسْلَامِ، قَالَ
اللَّهُ تَعَالَى: ﴿إِنَّ الدِّينَ عِنْدَ اللَّهِ الْإِسْلَامُ﴾ [آل عمران: ۱۹]
وَقَالَ اللَّهُ تَعَالَى: ﴿وَرَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا﴾ [المائدة: ۳]
وَهُوَ بَيْنَ الْغُلُوِّ وَالتَّقْصِيرِ، وَبَيْنَ التَّشْبِيهِ وَالتَّعْطِيلِ وَبَيْنَ الْجَبْرِ
وَالْقَدَرِ، وَبَيْنَ الْأَمْنِ وَالْيَأْسِ.

اللہ کا دین زمین و آسمان میں صرف ایک ہی ہے اور وہ دین اسلام ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ”بلاشبہ دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے“ اور فرمایا: ”اور میں نے اسلام کو تمہارے لئے بطور دین پسند کر لیا، یہ دین افراط و تفریط، تشبیہ و تعطیل، جبر و قدر اور بے خوفی و ناامیدی کے درمیان ہے۔“

قرآن کی اصطلاح میں، لفظ دین ان اصول و احکام کے لئے بولا جاتا ہے جو حضرت آدم ﷺ سے خاتم الانبیاء ﷺ تک سب انبیاء میں مشترک ہیں اور لفظ ”شریعت“ یا ”منہاج“ یا بعد کی اصطلاحات میں لفظ ”مذہب“ فروعی احکام کے لئے بولے جاتے ہیں، جو مختلف زمانوں اور مختلف امتوں میں مختلف ہوتے چلے آئے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ دین سب انبیاء علیہم السلام کا ایک ہی تھا اور لفظ ”اسلام“ کے لفظی معنی اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں اس معنی کے اعتبار سے ہر نبی و رسول کے زمانہ میں جو لوگ ان پر ایمان لائے اور ان کے لائے ہوئے احکام میں ان کی فرمانبرداری کی وہ سب مسلمان اور مسلم کہلانے کے مستحق تھے اور ان کا دین، دین اسلام تھا اور بعض اوقات یہ لفظ خصوصیت سے اس دین و شریعت کے لئے بولا جاتا ہے جو سب سے آخر میں خاتم الانبیاء ﷺ لیکر آئے اور جس نے پچھلی تمام شرائع کو منسوخ کر دیا اور جو قیامت تک باقی رہے گا اس معنی کے اعتبار سے یہ لفظ صرف دین محمدی ﷺ اور امت محمدیہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے۔ (معارف القرآن: ۳۶/۲)

فی الأرض والسماء: یعنی ہمارا دین زمان اور مکان کے اعتبار سے عام ہے، اسلام کا راجع زمین، سمندر، آسمان اور قضا ہر جگہ میں ہوگا۔

قوله: ”وهو بين الغلو والتقصير.“ ”غلو“: کے لفظی معنی حد سے نکل جانے کے ہیں اور ”تقصیر“: کے معنی میں حد سے کمی کرنا، شریعت اسلامیہ کا ہر حکم معتدل اور متوسط ہے افراط و تفریط سے پاک ہے، نہ تو شریعت موسویہ کی طرح اس میں شدت اور سختی ہے۔ (مثلاً طہارت حاصل کرنے کے لئے موضع نجاست کپڑے کا کاٹنا، زکوٰۃ میں

چوتھائی مال ادا کرنا وغیرہ) اور نہ شریعت عیسویہ کی طرح حد سے زیادہ نرمی اور آسانی ہے۔ (مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین میں شراب حلال تھی، سور اور مردار کا گوشت حلال تھا، قتل عمد میں قصاص واجب نہ تھا وغیرہ) شریعت اسلامیہ شدت اور سختی کے بین بین ہے۔ ”وخیر الأمور أوسطها۔“

قولہ: ”وبین التشبيه والتعطيل، وبين الجبر والقدر، وبين الأمن

والإياس۔“

فرقہ مشبہ کے لوگوں کے عقائد میں افراط ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کو مخلوق کے مشابہ قرار دیا اور اس کے لئے جسم اور جہت کو ثابت کیا ہے اور فرقہ معطلہ کے عقائد میں تفریط ہے وہ اللہ تعالیٰ کی صفات کی نفی کرتے ہیں، ان کے برخلاف اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جسم و جہت سے منزہ ہیں اور جن صفات کا ذکر قرآن و حدیث میں ہے وہ اللہ کے لئے ثابت ہیں۔ ﴿لیس کمثلہ شیء﴾ وهو السميع البصير ﴿میں دونوں کی تردید ہے ”لیس کمثلہ شیء“ میں مشبہ کی تردید ہے اور ”هو السميع البصير۔“ میں معطلہ کی تردید ہے۔

اسی طرح فرقہ قدریہ کے عقائد میں افراط ہے، انہوں نے بندوں کے لئے قدرت کا سبب اور قدرت خالقہ دونوں کو ثابت کیا ہے ان کے ہاں بندہ اپنے افعال کا کاسب بھی ہے اور خالق بھی، اور فرقہ جبریہ کے عقائد میں تفریط ہے ان کے ہاں بندہ جماد محض ہے نہ اس کو کسب کی قدرت حاصل ہے اور نہ خلق کی قدرت حاصل ہے ان دونوں کے برخلاف اہل سنت والجماعت کا عقیدہ یہ ہے کہ بندہ کے لئے قدرت خالقہ تو ثابت نہیں، کیونکہ وہ اللہ کے ساتھ خاص ہے۔ البتہ قدرت کا سبب ثابت ہے۔ حضرت علی علیہ السلام نے اس نازک مسئلہ کو بہت خوبی اور آسانی سے ذہن نشین فرمادیا تھا، چنانچہ ایک شخص نے حضرت علی کرم اللہ وجہہ سے مسئلہ جبر و اختیار دریافت کیا آپ ﷺ نے اس شخص سے فرمایا: ایک پیر اٹھا کر کھڑا ہو جا اس نے ایک پیر اٹھالیا پھر فرمایا کہ: دوسرا پیر اٹھالے، اس نے

عرض کیا حضرت دوسرا پیر تو نہیں اٹھ سکتا۔ فرمایا: یہی حالت بندہ کی ہے نہ پورا مختار ہی ہے نہ پورا مجبور۔ (ملفوظات اشرفیہ ص ۱۱۸)

اسی طرح یہ دین بے خوفی اور ناامیدی کے درمیان ہے، اسی لئے کہا گیا ہے کہ: ”الإيمان بين الخوف والرجاء“ ایمان کامل خوف اور امید کے درمیان ہے، کہ تمہا خوف لوگوں کو اللہ کے رحم و کرم سے ناامید اور محض رحم و کرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔

فهذا ديننا واعتقادنا طاهراً وباطناً. ونحن بُراءُ الى الله من كل من خالفَ الذي ذَكَّرنا وبَيَّنَّا ونسألُ الله تعالى أن يُثَبِّتَنَا عليه ويصَحِّمَ لنا به، ويعصمَنَا من الأهواءِ المُختلفة والآراءِ المتفرقة والمذاهبِ الرديئةِ كالمُشبَّهة والمعتزلة والجهميَّة والجبريَّة والقدريَّة وغيرهم ممَّن خالف السُّنَّة والجماعة واتَّبَعَ البدعة والضلالة ونحن منهم بُراءٌ وهم عندنا ضالَّ وأردياءُ وباللَّهِ العصمة والتوفيق.

یہ (کتاب کے اول سے لیکر یہاں تک) ہمارا دین ہے اور ظاہر و باطن میں یہی ہمارا عقیدہ ہے اور ہم اللہ کے سامنے براءت کرتے ہیں اس شخص سے جو اس طریقہ کا مخالف ہو جو ہم نے کتاب میں ذکر کیا اور ہم اللہ سے سوال کرتے ہیں کہ ہم کو ایمان پر ثابت قدم رکھیں اور ہمارا خاتمہ ایمان پر فرمائے اور ہم کو مختلف خواہشات سے بچائے اور مختلف مشوروں سے بچائے اور خراب مذاہب سے بچائے۔ جیسے مشبہ اور معتزلہ اور جہمیہ وغیرہ اور ان کے علاوہ ان لوگوں میں سے جنہوں نے سنت اور جماعت کی مخالفت کی اور گمراہی کے دوست بن گئے اور ہم ان سے بیزار ہیں اور وہی ہمارے نزدیک گمراہ اور گھنیا ہیں۔ اللہ ہی کے ساتھ عصمت (حفاظت) اور توفیق ہے۔

مشبہ: مشبہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنی صفات میں مخلوق سے تشبیہ دی۔ اس فرقے کا بانی داؤد جواری ہے۔

معتزلہ: معتزلہ وہ پہلا گروہ ہیں جنہوں نے عقائد کے باب میں اس چیز کے مخالف قواعد کی بنیاد رکھی، جس کو ظاہر سنت نے بیان کیا اور جس پر صحابہ رضی اللہ عنہم کی جماعت عمل پیرا رہی، گویا کہ معتزلہ کے تمام اصول اور ان کی تشریحات عقل و قیاس پر مبنی ہیں۔ واصل بن عطاء (۸۰ء، ۲۱ھ) کو مذہب اعتزال کا بانی کہا گیا ہے، واصل بن عطاء مشہور جلیل القدر تابعی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، حسن بصری رحمہ اللہ کی مجلس میں ایک دفعہ واصل بن عطاء بول پڑا کہ مرتکب کبیرہ نہ مؤمن ہے، نہ کافر اس طرح اس نے ایمان و کفر کے درمیان واسطہ ثابت کیا جس پر حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ”قد اعتزل عنا“ کہ یہ تو ہماری جماعت سے الگ ہو گیا معتزلہ نے خود اپنا نام اصحاب العدل والتوحید رکھا، مامون الرشید کے دور میں ان کی حکومت تھی۔

جہمیہ: یہ جہم بن صفوان ترمذی کی طرف منسوب ایک فرقہ ہے، جہم بن صفوان صفات باری تعالیٰ کی نفی اور تعطیل کا قائل تھا اور یہ عقیدہ دراصل اس نے جعد بن درہم کی تقلید کرتے ہوئے اپنایا، جہمیہ کا ایک تفردیہ بھی ہے کہ وہ جنت اور جہنم کے فناء کے قائل ہیں اور ایمان ان کے ہاں صرف معرفت کا نام ہے۔

جبریہ: فرقہ جبریہ وہ لوگ ہیں جو افعال اختیار یہ مثلاً کفر و ایمان، طاعت اور معصیت وغیرہ کے بارے میں بندہ کو مجبور محض مانتے ہیں۔ یہ فرقہ بھی جہم بن صفوان کی طرف منسوب ہے۔

قدریہ: قدریہ جبریہ کے برعکس انسان کو قادر مطلق مانتے ہیں۔ قدر اور تقدیر کا انکار کرتے ہیں، احادیث میں قدریہ کو اس امت کا مجوس کہا گیا ہے، کیونکہ مجوس دو خداؤں (یزاد اور اہرمن) کے قائل ہیں، جبکہ یہ حضرات ہر ایک کو قادر مطلق کہہ کر بے شمار خداؤں

کے قائل ہیں۔ کبھی جبریہ کو بھی قدریہ کہتے ہیں، کیونکہ مسئلہ قدر میں غلو سے کام لیتے ہیں۔
واللہ سبحانہ تعالیٰ اعلم

وآخر دعوانا ان الحمد لله رب العالمين

الحمد لله! آج بروز بدھ بوقت عشاء محرم الحرام ۱۴۲۶ھ بمطابق ۲۲ فروری ترجمہ
وشرح عقیدہ طحاویہ اختتام کو پہنچا۔ فلله الحمد أولاً و آخراً

احقر العباد

زر محمد غفرلہ



التشريح الوافي في حل

مختصر القدوري

ممنوع

مولانا نصيب الله (ابن الحاج عبدالصمد الميزني)

مدرس جامعه اسلاميه بحر العلوم سرياب كسٹم كونٹہ

﴿.....ناشر.....﴾

مکتبہ عُمر فاروق

4/491 شاه فيصل کالونی کراچی فون: 021-4594144-8352169

باب اور عنوان کے اعتبار سے جدید لغت

الْقَامُوسُ الْمَعْنَوِيُّ

جو تمام دفتری، ادبی، صحافتی، فنی، سائنسی، سیاسی، تجارتی اور عام
زندگی سے متعلق ہزاروں جدید لغات، محاورات، ضرب
الامثال اور روزمرہ کے ضروری جملوں پر مشتمل بہترین مجموعہ

مؤلف

حضرت مولانا مفتی حضرت علی صاحب
فاضل و متخص جامعہ فاروقیہ کراچی

تقریظ

مولانا ڈاکٹر منظور احمد مدینگل صاحب
استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ

تقریظ

مولانا ولی خان المنظر صاحب
استاذ حدیث جامعہ فاروقیہ

مکتبہ عمر فاروق

4/491 شاہ فیصل کالونی کراچی